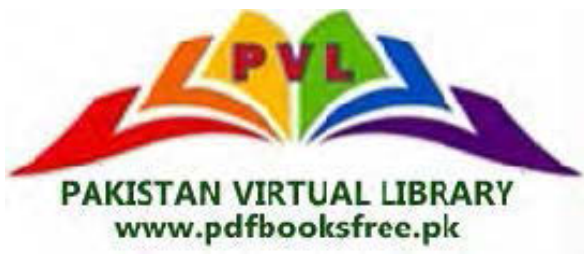


آواره

PDFBOOKSFREE.PK

ذوالفقار ارشد گیلانی

# آوارہ



ذوالفقار ارشد گیلانی

**علم دوست پبلیکیشنز**

25 سی لوئر مال لاہور۔ فون: 7325418



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : آوارہ

مصنف : ذوالفقار ارشد گیلانی

مطبع : اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور

قیمت : روپے

ڈسٹری بیوٹرز:

دُعا پبلی کیشنز

25 سی لوئر مال لاہور۔ فون: 7325418

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ، اردو بازار لاہور 0300-4213406



اللہ سب سے بڑا ہے

ناشر: خالد ڈوگر

علم دوست

پبلیکیشنز

CELL: 0300-4325121

## انتساب

اُن ”آوارگیوں“  
کے نام  
جو ہر جوانی کا حصہ ہوتی ہیں

## حرف آغاز

شروع اللہ کے نام سے

جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہ حیثیت اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے اور یہ قدرت بخشی ہے کہ وہ تدبیر کے ذریعے اپنی تقدیر لکھ لے۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ لفظ جسے ہم ”تقدیر“ کہتے ہیں، لوح محفوظ پر رقم ہے اور ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے عین مطابق ہوگا۔ اس لیے بعض لوگ ”تقدیر“ کے لفظ کو قابل مباحثہ سمجھتے ہیں جب کہ کچھ اسی کو بنیاد بنا کر لب کشائی سے معترض ہیں کہ تقدیر صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دی۔ بے شک تقدیر واقعی خالق کائنات کی تحریر کردہ ہے اور کوئی طاقت اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ درحقیقت تقدیر وہی ہے جو آپ کو مل رہا ہے خواہ وہ تدبیر سے ملے یا غیب سے۔ اس لیے بحث کرتے وقت یہ فراموش مت کیجئے کہ تقدیر اچھی ہے یا بری، عطیہ خداوندی ہے اور ہر دوسروں میں مصلحت الہی کا کوئی نہ کوئی پہلو اس میں ضرور کارفرما ہوتا ہے۔

”آوارہ“ بھی دراصل تقدیر کی کہانی ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ لڑکیوں کی تقدیر میں شاید امتیاز برتا گیا ہے۔ محاذ اللہ ایسا نہیں ہے۔ اس میں تحریف و ترمیم ممکن ہی نہیں جس نے جو بننا ہے، اور جیسے بننا ہے، اُس کا فیصلہ روزِ اوّل کر دیا گیا ہے اور وہی حتمی ہے۔

یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو بھول شخصے ”ہلکی تقدیر“ لے کر پیدا ہوئی۔ بچپن کچھ ماں کے ظلم و ستم سہنے میں گزر اور کچھ یتیمی کی نذر ہو گیا۔ پھر کچھ مہربان ملے جنہوں نے اس کی

خوبصورتی سے فائدہ ضرور اٹھایا لیکن وہ خود بھی پار اتر گئی۔ اُس نے اپنی کامیابیوں کی بڑی بھاری قیمت چکانی لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ برصغیر پاک و ہند کے فلمی افق پر ستارہ بن کر چمکی۔ اُس کے خُسن و جمال کا شہرہ ملک کی سرحدوں سے نکلا تو ایک مسلمان ریاست کا مالک و مختار اُس پر مر مٹا۔ وہ اُسے گندگی کے ڈھیر سے اٹھالے گیا اور نہ صرف ہیرا بتا کر دنیا کے سامنے پیش کیا بلکہ اُس کا مذہب بھی بدل ڈالا۔

لڑکی چونکہ بچپن سے اُس راستے پر چل رہی تھی جس میں گناہ و ثواب کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی اس لیے وہ محل میں رہ کر بھی پارسانہ بن سکی۔ اُس کی ایک وجہ اُس کا شوہر بھی تھا جو اُس کے ہوتے ہوئے جس مخالف سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بے راہ روی کا الزام اپنے شوہر کو دیتی تھی۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ وفا کا بدلہ اگر بے وفائی سے ملے تو خود کو بھی اسی سانچے میں ڈھال لینا چاہیے، اور اُس نے یہی کیا۔

پھر اُس کی تقدیر نے وہ دن بھی دکھائے جب وہ اُس ملک کی بلا شرکیت غیرے حکمران بنی۔ اُسے اللہ تعالیٰ نے یہ موقع بھی دیا کہ وہ اُن لوگوں سے زیادتیوں کا حساب لے سکے جو کبھی اُس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ اُس نے ایک ایک کر کے سب کو اپنی مملکت میں بدعو کیا اور اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا، جس کے وہ مستحق تھے۔ اُس نے انہیں یہ باور کرا دیا کہ عورت کمزور ضرور ہے لیکن اگر اُسے تنکے کے برابر بھی سہارا مل جائے تو پھر وہ ایسی چکی بن جاتی ہے جس میں گندم کے ساتھ گھسن بھی پس جاتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ خُسن کے بل بوتے پر ریاست کا دھارا تو شاید بدلا جاسکتا ہو لیکن ملکوں کی تقدیر نہیں بدلی جاسکتی چنانچہ وہ با اختیار ہو کر بھی بے اختیار بننے پر مجبور ہو گئی اور اُن راستوں پر چلنے لگی جو عالمی طاقتوں نے اُس کے لیے متعین کیے تھے۔۔۔ چنانچہ اُس نے شیتلا کلاوتی موہن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر کے ہر رائل میجسٹی کا روپ دھار لیا کہ حالات کا تقاضا یہی تھا۔

یہ شیتلا موہن کلکرنی سے شیتل کلکرنی اور پھر شیتل کلکرنی سے ملکہ شیتل رامیر بننے تک ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی ہے جسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ مجبور لڑکی کے ساتھ یہ معاشرہ کیا کرتا ہے اور پھر ایسی لڑکی اگر با اختیار ہو جائے تو وہ معاشرے سے کیا سلوک کرتی ہے۔



”آوارہ“ بھارتی فلم انڈسٹری کے پس منظر میں لکھی گئی ہے کیونکہ پاکستان کا معاشرہ دوغلا ہونے کے باوجود ایسے کرداروں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بھارتی فلم انڈسٹری کے بینر تلے بننے والی فلموں میں وزراء، ارکان پارلیمنٹ اور بڑے بڑے افسروں تک کو کرپٹ دکھایا جاتا ہے، ہندی فلموں میں مسلمان کردار بھی رکھے جاتے ہیں لیکن اگر کسی پاکستانی فلم میں ”مستند“ کرپٹ سیاست دان یا افسر کا سایہ بھی دکھایا جائے تو فلم رہے گی نہ فلم ساز۔ ہم وہ لوگ ہیں جو سرتاپا گناہوں میں لتھڑ کر بھی خود کو گنا گناہائے ہوئے بتاتے ہیں۔

بہر حال ”آوارہ“ کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اسے معروف ناول نگار ارونگ ویلس کے شہرہ آفاق ناول ”دی امپریس“ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ”دی امپریس“ ہالی ووڈ کی ساحرہ اور حسین و جمیل اداکارہ گریس کیلی کے پس منظر میں لکھا گیا جو شیتل کی طرح زندگی کے نہایت نچلے طبقے سے اٹھ کر سامنے آئی اور ہالی ووڈ میں برسوں اُس کا طوطی بولتا رہا۔ بالآخر وہ یورپ کی امیر ترین ریاست مناکو کے بادشاہ پرنس رنیز کو پسند آ گئی اور وہ اُسے شہزادی گریس کیلی بنا کر اُس سرزمین پر لے آیا جہاں آج بھی دنیا کے سب سے بڑے کیسینو موجود ہیں کیونکہ مناکو میں نہ صرف جوئے کو قانونی حیثیت حاصل ہے بلکہ اس چھوٹے سے ملک کی معیشت کا دار و مدار ہی ان جوئے خانوں کی آمدنی اور ان لوگوں کی آمد و رفت پر ہے جو جوا کھیلنے وہاں آتے ہیں۔

بہر طور ”آوارہ“ پڑھئے اور دیکھئے کہ حالات کب اور کیسے ..... کیسی کیسی کروٹیں لیتے ہیں۔۔۔ اور انسان سب کچھ میسر ہونے کے باوجود خود کو کس طرح بے بس محسوس کرتا ہے۔

اللہ حافظ

پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

ذوالفقار ارشد گیلانی

راولپنڈی

22 اپریل 2007ء

gilani@gilani.com.pk

zulfiqar.gilani@gmail.com

کراچی انٹرنیشنل ائر پورٹ کی بے نمبر 17 پر الگ تھلگ کھڑا ائر انڈیا کا دیو بھل بوننگ 747 طیارہ پرواز کے لیے تیار تھا کہ وی آئی پی لاؤنج کی جانب سے آنے والی ایک سیاہ مرسدیز بینز جس کے بونٹ پر دائیں جانب کسی غیر ملک کا قومی پرچم لہرا رہا تھا، فرسٹ کلاس کی سیڑھیوں کے قریب آ کر رکی اور سیاہ سوٹ پہنے دو طویل قامت افراد عقبی نشست سے اتر کر جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دروازے پر کھڑی خوبصورت ائر ہوسٹس نے مسکرا کر انہیں خوش آمدید کہا اور آداب میزبانی کے طور پر ان کے بریف کیسوں کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور اندرونی جانب بڑھ گئے۔ ان کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی مخصوص نشستوں کے بارے میں پہلے سے آگاہ ہیں۔

دونوں طویل قامت افراد ایک گھنٹہ قبل ہی بحریت کے دار الحکومت ریال سے بحریت کی شاہی فضائی کمپنی شیتل ایئرویز کے ذریعے کراچی پہنچے تھے۔ ان کے پاس سفارتی پاسپورٹ تھے اور وہ شاہ بحریت کے خصوصی نمائندوں کی حشیئت سے براستہ کراچی، نئی دہلی کا سفر کر رہے تھے۔ ایئر انڈیا کے بوننگ میں داخل ہونے والے وہ آخری مسافر تھے کیونکہ اگلے ہی لمبے سیڑھیاں ہٹائی گئیں اور جہاز کے دروازے بند ہو گئے۔ کنٹرول ٹاور سے آل کیلٹر کا گنٹل ملنے کے ساتھ ہی طیارہ ٹیکسی وے کی طرف روانہ ہو گیا اور چند منٹ بعد وہ نئی دہلی کی جانب مچو پرواز تھا۔

دہلی کے اندر اگانڈھی انٹرنیشنل ائر پورٹ پر اُن کے استقبال کے لیے کوئی شخص موجود نہ تھا لیکن ائر پورٹ کے باہر سیاہ رنگ کی ایک اسٹیشن وگن اُن کی منتظر تھی۔ دونوں افراد اپنے سفر کے سابقہ حصے کی طرح اب بھی خاموش تھے۔ ڈرائیور نے اُن کے لیے دروازہ کھولا اور



جونہی وہ اندر بیٹھے، ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔

اسٹیشن ونگن کے سفر کا اختتام صفدر جنگ روڈ پر واقع، بحریت کے شاہی سفارت خانے کی خوبصورت عمارت کے سامنے ہوا۔ دونوں خاموشی سے اترے اور اندر داخل ہو گئے۔ اُن سے کسی نے کوئی تعرض نہ کیا حتیٰ کہ سفیر کے عالی شان دفتر کے باہر کھڑے باوردی محافظ نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔

سفیر بھی جیسے انہی کا منتظر تھا۔ اس نے اُٹھ کر دونوں کو خوش آمدید کہا لیکن کوئی استقبالیہ جملہ ادا نہیں کیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سب کچھ مٹینی انداز میں ہو رہا ہے اور پہلے سے طے ہے۔ سفیر نے بدستور خاموشی کا انداز اختیار کیے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیے اور دونوں نے اپنے اپنے بریف کیس اس کے سامنے میز پر ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی اپنی جیبوں سے ایک چابی نکال کر میز پر رکھ دی۔ سفیر نے دائیں سمت کی دراز کھول کر چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ ہر بریف کیس میں دو دو تالے تھے۔ سفیر نے پہلے مہمانوں کی دی ہوئی چابیاں ایک ایک تالے میں لگائیں اور پھر اپنی چابیوں کی مدد سے دونوں بریف کیسوں کو غیر مقفل کر دیا۔

پہلے بریف کیس سے کچھ دستاویزات برآمد ہوئیں جب کہ دوسرے بریف کیس میں صرف دیدہ زیب کاغذ کے لفافے تھے جو ایک پیکٹ کی صورت ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ سفیر نے ربن کھول کر لفافوں پر لکھے پتے دیکھے اور پھر سوالیہ نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھنے لگا۔

”انہیں فوری طور پر محفوظ طریقے سے حوالہ ڈاک کر دیا جائے، ہر ایک سی لینی“ دونوں میں سے ایک مہمان نے پہلی اور آخری بار زبان کھولی۔ ”یہ ملکہ عالیہ کی طرف سے ہیں۔“

سلمیٰ فاروق نے کرسی پر بیٹھ کر آکاش اسٹوڈیوز کے ایگزیکٹو آفس کی کھڑکی کا پردہ ہرکایا اور نیچے جھانکنے لگی۔ لٹخ ناٹم تھا اور اسٹوڈیوز کی گلیاں، اداکاروں، ہدایت کاروں، کہانی نویسوں اور مزدوروں سے بھری ہوئی تھیں جو آپس میں ہنسی مذاق کرتے اور حال احوال دریافت کرتے، سلمیٰ کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر سلمیٰ فاروق کا سر مارے فخر کے بلند ہو گیا۔ وہ تمام اس کے حکم کے تابع تھے اور وہ ان کی واحد ”مالکن“ تھی۔

سلمیٰ فاروق، آکاش اسٹوڈیوز کی پروڈکشن ہیڈ اور بسبئی کی فلمی دنیا کی وہ پہلی عورت تھی جو ملازم ہونے کے باوجود اس عہدے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ سینتیس سالہ سلمیٰ میں کوئی نسوانی کشش نہیں تھی اور شاید اسی لیے اس کے فیصلے اٹل، سرد اور غیر چمک دار ہوتے تھے۔ پورا اسٹوڈیو اُس کے احکامات پر ناچتا تھا جب کہ خود سلمیٰ، ایسٹرن میٹکرز اور انٹرنیشنل اسٹاک ہولڈرز کے ایک گروپ کو جوابدہ تھی جو آکاش اسٹوڈیوز کے مشترکہ مالکان تھے۔

اسٹوڈیوز کی سربراہ ہونے کے ناتے گزشتہ پانچ سال میں سلمیٰ کی کارکردگی غیر معمولی رہی تھی۔ اس عرصے میں سلمیٰ کی ذاتی نگرانی میں آکاش پروڈکشنز کی بننے والی فلموں نے دس نیشنل ایوارڈز، چوبیس گاندھی ایوارڈز، پندرہ مے فیئر ایوارڈز اور اٹھارہ کس انٹرنیشنل ایوارڈز حاصل کیے۔ دو فلمیں مشہور زمانہ آسکر ایوارڈز اور ایک اکیڈمی ایوارڈز کے لیے نامزد ہوئی۔ کئیز کے فلمی میلے میں دو فلمیں ایوارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں جب کہ ان کے علاوہ کئی فلموں نے نہ صرف بین الاقوامی شہرت حاصل کی بلکہ انہیں متعدد غیر ملکی زبانوں میں بھی ڈب کیا گیا۔

سلمیٰ کی سربراہی میں آکاش اسٹوڈیوز نے نہ صرف سب سے زیادہ ہندی فلمیں ریلیز کیں بلکہ اسٹوڈیوز کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تامل، بنگالی اور پنجابی فلموں کی پروڈکشن کا آغاز

ہوا اور کم و بیش ہر دوسری فلم نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

لیکن اپنے ملازمین کے ساتھ سلمیٰ کا رویہ بے حد سخت تھا اور وہ اُن سے زیادہ ملنا جلتا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اپنا زیادہ تر وقت وہ اپنے دفتر میں ہی گزارتی البتہ کبھی کبھار لُنج کے لیے گرین روم میں اپنی مخصوص میز پر آ بیٹھتی جو اس کے عالی شان سوٹ کا ایک حصہ تھا اور جسے اس نے اپنے پیش رو فنانس ڈائریکٹر جے جے سکینہ سے ورثے میں حاصل کیا تھا۔

سلمیٰ شاید یہ ”ورثہ“ حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتی لیکن سکینہ نے اپنی بنگالی محبوبہ کو سپر اسٹار بنانے کے لیے اسٹوڈیوز کے اکاؤنٹس کا بے دریغ استعمال کیا۔ نتیجتاً اسے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے اور سلمیٰ جس نے کبھی اس حیثیت کا خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا، سکینہ کی وارث قرار پائی۔

ایگزیکٹو آفس کا دروازہ اچانک کھلا اور اس کی سیکرٹری ورشا گولڈن لہراتی بل کھاتی اندر داخل ہوئی۔ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ ورشا بھی اُسے ورثے میں ملی تھی۔ ورشا کا باپ ہندو اور ماں انگریز تھی۔ اس طرح وہ ہندی اور برطانوی خون کا خوبصورت امتزاج تھی۔ اس کی عمر تقریباً پچیس سال تھی۔ اس کا باپ سپریم کورٹ کا جج تھا۔ ورشانے اپنی نو عمری اور نو جوانی کا بیشتر حصہ برطانیہ اور فرانس میں گزارا تھا اور وہ ہندی سے زیادہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں روانی سے بولتی تھی۔

ورشا کو اس ملازمت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کا باپ اور جے جے سکینہ گہرے دوست تھے۔ وہ محض شوقیہ طور پر سمبہی کی فلمی دنیا کے سب سے بڑے آکاش اسٹوڈیوز کو دیکھنے آئی تھی لیکن فلم کی چکا چوند میں ایسی کھوئی کہ یہیں کی ہو رہی۔ سکینہ نے اسے اپنی سیکرٹری بنالیا کیونکہ ورشا فلم اسٹار بننے کو تیار تھی نہ اس کا باپ اس پر رضامند ہوا۔ ورشا کی صلاحیتیں بہت جلد کھل کر سامنے آ گئیں۔ اور رفتہ رفتہ وہ سکینہ کی ضرورت اور اس سے بڑھ کر کمزوری بنتی چلی گئی۔

شروع شروع میں سکینہ اسے اپنے دوست کی بیٹی ہی سمجھتا رہا لیکن پھر ورشا کا خُسن سکینہ کی نیت اور رشتے کے احترام پر غالب آنے لگا۔ سکینہ نے ورشا کو یہ باور کرانا شروع کر دیا کہ سیکرٹری درحقیقت اپنے باس کی دفتری بیوی ہوتی ہے۔ ورشا مغربی معاشرے

میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی چنانچہ اُسے سکسینہ کی نیت اور نصیحت سمجھنے میں کسی دُشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس نے اس بوڑھے کو اپنی اداؤں سے تسخیر کرنے میں کوئی قباحت محسوس کی نہ شرم چنانچہ کچھ ہی دنوں میں وہ سکسینہ کی دفتری بیوی کے فرائض بھی بہ حسن و خوبی انجام دینے لگی۔

اسی تعلق کی بنیاد پر سکسینہ کی برطرفی کے وقت ورثا نے بھی رخت سفر باندھ لیا لیکن سہلی نے اسے جانے نہیں دیا اور سابقہ عہدے پر ہی بحال رکھا۔ اب چونکہ ورثا کی باس ایک عورت تھی اس لیے اس نے اپنے جسم کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوسرے ذرائع تلاش کر لیے لیکن اُس کی ان حرکتوں سے سہلی کے لیے اس کی وفاداریاں متاثر نہیں ہوتی تھیں۔

اس وقت ورثا، اپنی مالکن کے لیے ڈاک لائی تھی جو ایک ہی خوبصورت لفافے پر مشتمل تھی۔ سہلی نے لفافے لے کر اس پر نظر دوڑائی۔ وہ بحریت سے شیتل نے بھجوایا تھا۔ اسے اس طرح کے لفافے پہلے بھی موصول ہوتے رہے تھے لیکن اس میں کوئی خاص بات تھی کیونکہ اوپر ہی ”خالص ذاتی“ کے الفاظ تحریر تھے جو یقینی طور پر خود شیتل کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

سہلی نے لفافہ کھول ڈالا۔ لفافے کی طرح کارڈ بھی مس سہلی فاروق اور مہمان کے نام تھا۔ سہلی کے ذہن میں اپنا شوہر فاروق ابھر آیا لیکن اس نے سر جھٹک کر دعوت نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔

ہزار امپیریل میجسٹی رامیر زاہدی، شہنشاہ بحریت  
اور

ہزار امپیریل میجسٹی، ملکہ شیتل رامیر زاہدی  
خاندان زاہدی کی تین ہزار سالہ

اور

اپنی شادی کی پندرہویں سالگرہ

کے جشن میں آپ کو مدعو کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

سلمیٰ نے مزید نیچے نگاہ دوڑائی۔ تقریب کے انعقاد میں ابھی کئی ماہ باقی تھے۔ سلمیٰ کی معلومات کے مطابق یہ جشن خیموں کے ایک شہر میں برپا ہونا تھا جو ریال کے قریب صحرا کے دامن میں ابھی زیر تعمیر تھا لیکن اس کی پبلٹی ابھی سے شروع کر دی گئی تھی اور دنیا بھر میں مہمانوں کو دعوت ناموں کی تقسیم کا آغاز کر دیا گیا تھا۔

سلمیٰ نے لفافہ میز پر واپس رکھنا چاہا تو ایک چھوٹا سا کاغذ نکل کر اس کی گود میں آگرا۔ اس نے فوراً اسے اٹھالیا۔ شیتل نے اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا۔

”ڈارلنگ سلمیٰ! پلیز، ضرور آنا۔ مجھے تمہاری بے حد ضرورت

ہے۔ کوشش کرنا کہ جشن کے آغاز سے ایک ہفتہ قبل ریال پہنچ

جاؤ۔ میں نے اسٹوڈیوز کے کچھ پرانے ساتھیوں کو بھی آنے کی

دعوت دی ہے۔۔۔ ہمیشہ تمہاری، شیتل۔“

سلمیٰ نے ذاتی نوٹ دوبارہ پڑھا۔ وہ بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔ اب اس کا مزید کچھ کرنے کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ اس نے انٹرکام اٹھایا اور ورشا کو بمبئی فلم انڈسٹری کے ایک طاقت ور ایجنٹ کے ساتھ اکٹھے لنچ کرنے کا پروگرام منسوخ کرنے کی ہدایت کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ پرتھوی بے حد بھٹائے گا لیکن اس سے سلمیٰ کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا۔ پرتھوی جیسے کئی ایجنٹ اور پروڈیوسر، کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے۔

سلمیٰ کا شو۔ فاروق ان دنوں سری لنکا میں تھا۔ وہ ایک ہدایت کار کی حیثیت سے آکاش اسٹوڈیوز کے لیے تیسری فلم بنا رہا تھا اور آج کل کولمبو کے گرد و نواح میں اس کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ سلمیٰ کے ساتھ شادی سے قبل وہ کچھ بھی تھا لیکن اس وقت اس کا شمار بھارتی فلم انڈسٹری کے طاقت ور ترین افراد میں ہوتا تھا کیونکہ وہ بمبئی کی اکلوتی اور ذی حیثیت ”فلم لیڈی“ کا شو ہر تھا۔

سلمیٰ سوچنے لگی کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ کسی چھوٹے سے پروجیکشن روم میں بیٹھا اب تک کی شوٹنگ کے رش پرنس دیکھ رہا ہوگا؟ ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں بیٹھا اگلے روز کی شوٹنگ کی منصوبہ بندی کر رہا ہوگا؟ یا پھر اپنی فلم کی خوبصورت ہیروئن سنیتا کے ساتھ کمرے میں بند اس کے نازک جسم سے کھیل کر اپنی بیوی کی بد صورتی کے داغ دھور ہا ہوگا؟

سینٹا، بھارتی فلم انڈسٹری کی ٹاپ اسٹار تھی۔ سلمیٰ کو علم تھا کہ وہ اپنے ہر ہدایت کار کے ساتھ جسمانی طور پر ملوث ہو جاتی ہے۔ فاروق نے ضد کر کے سینٹا کو فلم میں کاسٹ کیا تھا۔ وہ فاروق کی اس ضد کی وجہ بھی جانتی تھی لیکن اس کے باوجود سلمیٰ نے بخوشی اس منصوبے کی منظوری دے دی تھی۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اس وقت سلمیٰ کو سینٹا کیا یاد آئی کہ اس کا اپنا سارا ماضی ایک فلم کی مانند اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

وہ مدراس کے اس چھوٹے سے مکان میں پہنچ گئی جہاں اپنے ماں باپ کے ساتھ کسپرس کی زندگی گزارا کرتی تھی۔ اللہ نے دولت تو خیر کیا دینی تھی، اُسے کوئی خاص شکل و صورت بھی نہ دی تھی کہ کوئی اسے نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا کر لیتا۔ اس نے گریجویشن کیا اور ان دنوں ایک اسکول میں ٹیچرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔۔۔۔۔ عام سی شکل و صورت کے باوجود دوسری لڑکیوں کی طرح سلمیٰ کی جوانی بھی دیوانی تھی۔ اسکول سے واپس آ کر اس کا سارا وقت اپنے بیڈروم میں گزرتا جہاں وہ شام ڈھلنے تک مختلف فلمی رسالے چائی رہتی۔ یہ ڈمپل کپاڈیہ، سری دیوی اور جیہ پرادا کا دور تھا اور سلمیٰ ان کی تصویریں دکھ دکھ کر خود کو بھی انہی میں سے سمجھنے لگی تھی۔

مدراس، بمبئی سے دُور ضرور تھا لیکن فاصلہ اتنا زیادہ بھی نہ تھا کہ پرواز کا شوقین بچھی وہاں تک پہنچ نہ پائے۔ سلمیٰ کے سر میں جانے کیا سودا سمایا کہ اس نے بمبئی کا رخت سفر باندھ لیا۔ اپنی شکل و صورت کی وجہ سے اسے یہ تو یقین تھا کہ وہ ہیر و ون تو کیا، ایکسٹرا بننے کے قابل بھی نہ تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آخر انڈسٹری صرف ہیر و ونوں کے بل بوتے پر تو نہیں چلتی۔ ایسے لوگ بھی ضرور ہوں گے جو پس پردہ رہ کر اسکرین پر آنے والوں کی کامیابیوں کا ذریعہ بنتے ہوں گے۔

کئی ہفتے وہ بمبئی کی خاک چھانتی رہی۔ یہاں اس نے اپنے دُور پار کے رشتے داروں کے ہاں قیام کیا۔ صبح نکلتی اور شام کو ڈھول مٹی میں اٹی ہوئی واپس پہنچتی لیکن اب تک اسے کسی نے نوکری تو گنجائش بھی نہ ڈالی تھی۔ اسکول سے وہ چھٹی لے کر آئی تھی۔ ارادہ یہی تھا کہ یہاں نوکری مل جاتی تو وہاں استعفیٰ دے دیتی مگر مختلف اسٹوڈیوز کے چوکیدار اور ری سپشن گزرتو اسے پہچاننے لگی تھیں البتہ نوکری دینے پر اسے کوئی تیار دکھائی نہ دیتا تھا۔



آکاش اسٹوڈیوز کے بھی اس نے بے شمار چکر لگائے۔ پہلے تو اسے نکاسا جواب ملتا رہا لیکن جب اس نے ”ڈھٹائی“ کی حد کر دی تو اسٹوڈیوز کی پرسنل ہیڈ اور ہیومن ریسورسز کی انچارج مسز پرگولیا کو اس پر رحم آ ہی گیا۔

”سلی“ مسز پرگولیا نے اسے اپنے سامنے گرسی پر بٹھا کر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”تم فلموں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”صرف اتنا ہی جتنا کہ کوئی عام شخص جانتا ہے۔“ سلی نے کوشش کی تھی کہ اس کا لہجہ پُر اعتماد ہو۔ ”میری معلومات اتنی ہی ہیں جتنی پردہ اسکرین پر نظر آتی ہیں یا اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔“

”نہیں“ مسز پرگولیا نے سرکونی میں جنبش دی۔ ”فلم انڈسٹری کو اسٹوڈیوز کی چار دیواری کے باہر روشنیوں کی دنیا اور گلیمر ورلڈ کہا جاتا ہے۔ یہ دور سے بے حد پرکشش دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔“ مسز پرگولیا نظریں جمائے سلی کے چہرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی جس کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ ”فلمی دنیا درحقیقت گندگی کا ڈھیر ہے۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔“ سلی کے حلق سے منمناہٹ سی برآمد ہوئی لیکن مسز پرگولیا نے اس مختصر سی ”جی“ پر کوئی دھیان دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

”۔۔۔۔۔ اس سے تعلق رکھنے والے لوگ فرشتے ہیں نہ پارسا۔ پردہ سیمیں پر نظر آنے والے حسین ترین چہرے غلاظتوں سے اٹے ہوئے ہیں۔“ مسز پرگولیا کے الفاظ سے سلی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ”اسٹوڈیوز کی چار دیواری کے اندر دنیا کی ہر برائی موجود ہے۔ اگر تم ان غلاظتوں اور برائیوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہو، ان کا حصہ بن سکتی ہو اور ان کی پردہ پوشی کر سکتی ہو تو میں تمہیں ملازمت دینے کو تیار ہوں۔“

سلی کے لیے یہ سب کچھ نیا اور اجنبی تھا۔ اس کے ذہن میں تو فلم انڈسٹری کا بے حد جگمگاتا اور دمکتا امیج تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ دور سے اُجلے نظر آنے والے لوگ اندر سے اتنے گندے ہوں گے۔ فوری طور پر اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر واپس دوڑ لگا دے لیکن یہ صرف لمحاتی سوچ تھی۔ فلم انڈسٹری تک رسائی اس کا خواب تھا۔ مسز پرگولیا اسے ملازمت دینے کو تیار تھی چنانچہ سلی اپنے خواب کی تعبیر پانے کے اس قدر قریب پہنچ کر اس سے محروم نہیں ہونا چاہتی

تھی۔

”تمیں تیار ہوں، مسز پرگویا۔“ سلٹی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ٹھیک ہے۔“ مسز پرگویا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تم پیر سے کام پر آ جاؤ۔ تمہاری

ڈیوٹی فائل روم میں ہوگی۔ بعض اداکاروں کے نام آنے والے خطوط کے جواب تمہیں دینے ہوں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ تم اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہو۔“

مسز پرگویا کی حوصلہ شکن باتوں کے باوجود سلٹی اتنی خوش ہوئی کہ وہ اپنی تنخواہ کا پوچھے بغیر ہی گھر واپس آ گئی۔

پیر کو اسٹوڈیوز پہنچنے والی وہ پہلی ورکرتھی۔ یہ اس کے خوابوں کی سرزمین تھی جس پر سری دیورائے، متان خان، راجندر پرشاد اور آ دی نارائن جیسے ارب پتی حکمرانی کر رہے تھے لیکن سلٹی کے لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی کیونکہ اس کے لیے بمبئی اداکارہ نئی، دلیپ کمار، پران، کشور کمار، نرگس، راج کپور اور سنیل دت کے علاوہ ایسا تبھہ بچن، جیہ بچن، پدمنی کولہاپوری، ساریکا اور دونو دکھنہ کا شہر بھی تو تھا۔ اور وہ اس کی نظر میں ایسے لوگ تھے جن سے کسی کی پہچان باعث فخر ہو سکتی تھی۔

بہت جلد سلٹی، آ کاش اسٹوڈیوز کی چکا چوند روشنیوں میں کھو گئی۔ سری دیوی، جیہ پرادا اور رتی گئی ہوتی، جن کے نام اس نے محض رسالوں میں پڑھے تھے، اب اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ ایسا تبھہ، دھر میندر اور ہیما مالینی اس کے آئیڈیل ہوا کرتے تھے چنانچہ جب وہ پہلی مرتبہ ان کے سامنے گئی تو زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ حالانکہ اس نے ان سے پوچھنے کے لیے بہت سے سوالات اپنے ذہن میں مرتب کر رکھے تھے۔ وہ بس یک یک انہیں دیکھتی رہ گئی لیکن یہ کسی ڈریا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے احترام کی وجہ سے تھا۔

اسٹوڈیوز میں اس کا پہلا اسائنمنٹ بڑا سیدھا سادا تھا۔ وہ پریس ریلیز اخبارات کو بھجواتی۔ فوٹو گیلری سے تصاویر حاصل کرتی اور ان کی تفصیلات تحریر کرتی۔ اسٹارڈسٹ، مودی اور فن فیئر جیسے رسالوں کے نمائندے اس سے آ کاش اسٹوڈیوز کے ستاروں کی بابت بہت سے سوالات کرتے اور وہ پالیسی کے مطابق ان کے جوابات دیتی۔ اس طرح وہ دیکھا، راکھی، نیتو سنگھ اور ڈمپل کپاڈیہ کے بارے میں بہت کچھ جان گئی لیکن ان میں سے کسی نے

بھی اسے اتنا مرعوب نہیں کیا، جتنا آکاش اسٹوڈیوز کی شیتل ملکر نی نے کیا تھا۔  
شیتل ملکر نی۔۔۔۔

بہمن فلمی دنیا کی ٹاپ کلاس اور صفِ اوّل کی نوجوان اور خوب صورت ترین اداکارہ جس نے اپنے کیریئر کا آغاز اسٹیج پر ایک ایکسٹرا کی حیثیت سے کیا۔ پھر وہ اشتہاری دنیا میں آئی اور ایک ماڈل کی حیثیت سے وہ کئی مصنوعات کی بے پناہ خرید و فروخت کا باعث بنی۔ اس کے معصوم حسن اور بے دارغ شفاف جلد کی بنا پر اسے ”انڈین میڈونا“ کا خطاب دیا گیا۔ فلمی پنڈتوں کا کہنا تھا کہ شیتل سے پہلے آنے والی اداکاراؤں کا حسن میک اپ کا محتاج ہوتا تھا لیکن شیتل کو کسی میک اپ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ شیتل جیسی حسین ساحرہ آج تک بھارتی فلم انڈسٹری میں آئی ہے نہ آئندہ کئی سال تک آئے گی۔

شاید یہ شیتل کا حسن تھا یا اس کی اداکاری کہ وہ بہت جلد اسٹیج اور اشتہارات کی محدود فضا سے نکل کر فلم کی لامحدود وسعتوں میں پہنچ گئی۔ وہ سلیکٹیو اس قدر پسند تھی کہ سلیکٹیو نے اس کے تمام رسمی، غیر رسمی، نجی اور خفیہ انٹرویوز کی تفصیلات جمع کر رکھی تھیں۔ وہ اس کے کشمیری والدین، بہمنی کے وٹسر مشنری کالج اور ایسی بہت سی چیزوں کے بارے میں جانتی تھی، جن کے بارے میں شاید خود شیتل کو بھی کچھ یاد نہ تھا۔

لبے سنہرے بالوں، کھڑی ناک، معصوم سی نیلی آنکھوں اور گورے چنے رنگ کی مالک شیتل کو یہ مقام چاندی کی کٹھنری میں رکھ کر نہیں ملا تھا بلکہ اس کے حصول کے لیے اسے نہ صرف بے تحاشا محنت کرنی پڑی تھی بلکہ اپنے جسم کے بے دریغ استعمال کو بھی گوارا کرنا پڑا تھا۔ وہ جب فلم انڈسٹری میں داخل ہوئی تو ایک لائٹ مین سے لے کر ہدایت کار تک، ہر ایک کے بستر کی زینت بنی لیکن شیتل نے ہر بار ایک رات کی ڈلہن بن کر محض اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل نہیں کی بلکہ اس بات کا اعتراف سب کرتے تھے کہ جب وہ کسی کے ساتھ رات گزار کر اگلی صبح بستر سے اترتی تھی تو اس کے مقام اور حیثیت میں اتنا ہی اضافہ ہو چکا ہوتا تھا جتنی محنت اس نے اپنے عارضی شوہر کو خوش کرنے کے لیے کی ہوتی تھی۔

وادی کشمیر کی رہنے والی شیتل کی بہمنی کی زندگی دوسروں کے لیے ایک کھلی کتاب تھی لیکن درجنوں بستروں کی زینت اور سینکڑوں ہاتھوں کا کھلونا بننے والی شیتل اب جو ہو میں

درختوں میں گھرے ایک وسیع و عریض اور خوبصورت بنگلے میں رہتی تھی اور شہر کے چھٹے ہوئے گھر کے اس کی حفاظت پر مامور تھے کیونکہ شیتل کلکرنی نے بھارتی فلم کی ”سیکس سمبل“ کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی تھی وہ اُس کی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی۔

اتنی بڑی اداکارہ ہونے کے باوجود شیتل، آکاش کی ان چند اداکاراؤں میں شامل تھی جو سلی کی مسکراہٹوں کا جواب اپنا خوب صورت بالوں والا سنہرا سر ہلا کر دیتی تھی۔ سوائے ایک ناپسندیدہ لمحے کے، دونوں کے تعلقات میں کوئی ایسا موڑ نہیں آیا تھا جس سے کسی کھنچاؤ کا احساس ہو پاتا۔ اور اگر دیکھا جائے تو وہی ناپسندیدہ لمحہ، سلی کی زندگی بدل گیا تھا۔ یہ کہا جاتا تو بالکل بے جا نہ ہوتا کہ سلی آج جو کچھ تھی، محض شیتل کی وجہ سے تھی۔

سلی فاروق نے ہلکا سا لٹچ لیا اور واپس اپنی ریوالونگ چیئر پر پہنچ گئی۔ اس کا دن خاصا مصروف تھا۔ آکاش اسٹوڈیوز کی ایک لمبی کاسٹ فلم دو دن پہلے ہی سرکٹ میں ریلیز ہوئی تھی اور اسے اس کی بزنس رپورٹ لینی تھی۔ اس نے کلکتہ، دہلی، آگرہ اور مدراس سے فلم کے بزنس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر وہ اسکرین روم میں چلی آئی جہاں اس نے تین کروڑ روپے کی خطیر رقم سے بننے والی فلم کے رش پرنس دیکھے۔ درشا اس کے پہلو میں بیٹھی اس کی ہدایات نوٹ کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر سلی بالکل خوش نہیں ہوئی کہ ہیرا اور ہیراؤن نے محبت کے سین فلم بند کرانے میں کئی ری ٹیکس کرائے تھے۔ اس کے ذہن میں پھر شیتل ابھر آئی جس کے ہاں ری ٹیک نام کی کوئی شے نہ ہوا کرتی تھی۔

پندرہ سال۔۔۔

”سلی!۔“ اسے راہول کی آواز اب بھی اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پبلٹی ڈپارٹمنٹ میں اس کا باس تھا۔ ”کیا تم یہ نئے پورٹریٹ منظوری کے لیے دیوی کے ڈریسنگ روم میں لے جاؤ گی، اگر ان میں کوئی ایک منظور ہو جائے تو ’مے فیئر‘ والوں کو آج ہی بھجوا دیتا۔“

سلی نے دس ضرب بازہ کے پورٹریٹس کا فولڈر اٹھایا اور اسٹیج 18 کی طرف چل دی جہاں شیتل کلکرنی، جسے تمام لوگ دیوی کہہ کر پکارتے تھے، کا ڈریسنگ روم واقع تھا۔ اسٹیج بھانت بھانت کے اداکاروں اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا لیکن دیوی کے ڈریسنگ روم کا دروازہ

بند تھا۔

سلمیٰ نے دروازے پر دستک دینے کا تکلف بھی نہ کیا اور اسے کھول کر دروازہ وار اندر ٹھکس گئی لیکن سامنے اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اسے انہی قدموں پر منجمد کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتی کمرے کے نیم تاریک گوشے سے ایک مردانہ آواز اسے سنائی دی۔

”دروازہ بند کرو گدھے کی بچی!“

سلمیٰ نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔

وہ دوبارہ پلٹی۔۔۔ اب اُس کی آنکھیں ملگجے اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔

کمرے پر بیٹھے ہوئے مرد کا نام انیل کمار تھا۔۔۔ جسے بھارتی فلم انڈسٹری کا شہنشاہ کہا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں لیکن چہرے پر لذت و آسودگی ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

اُس کے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہ تھی۔ اُس نے ٹانگیں چوڑی کر رکھی تھیں اور ایک دھان پان سی۔۔۔ سنہرے بالوں والی لڑکی کا سر تیزی سے اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ سلمیٰ کو اُس لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ دودھیا کمر اور بالوں سے ہی سمجھ گئی تھی کہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انیل کمار کو لطف و سرور بخشنے والی۔۔۔ چینی گڑیا اور سبھی فلم انڈسٹری کی دیوی شیتل کلکرتی تھی۔

سلمیٰ نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

چند ثانیوں بعد اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔۔۔ شیتل اب بھی گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی لیکن اس بار اُس کا چہرہ سلمیٰ کی طرف تھا۔۔۔ شیتل کے بال اُس کے چہرے کے دونوں جانب ہالہ کیے ہوئے تھے مگر سلمیٰ کو اُس کا بھرا بھرا سینہ صاف دکھائی دے رہا تھا جسے انیل کے ہاتھ کسی وحشی کی طرح مسل رہے تھے۔ شیتل کے چہرے پر بھی سلمیٰ کو وہی آسودگی نظر آئی تھی جو انیل کے چہرے پر تھی۔ وہ سلمیٰ کی جانب دیکھ کر مسکرائی اور باتیں آنکھ دبا دی۔۔۔ سلمیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے یہ سب دکھانا چاہ رہی ہو۔

عین اُسی وقت۔۔۔ شیتل کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور بے اختیار اُس کے حلق سے ایک کراہ خارج ہو گئی۔۔۔ شیتل نے ہونٹ دانتوں میں دبالیے مگر اُس کے چہرے پر کرب یا تکلیف کے آثار نہ تھے۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

سلمیٰ نے انیل کی جانب دیکھا۔۔۔ اُس نے اپنے دانت جھک کر شیتل کی نرم و نازک اور سرخ و سپید کمر میں گاڑ رکھے تھے لیکن اُس کی نظریں سلمیٰ پر ہی مرکوز تھیں۔  
 ”کُتیا!“ وہ حلق کے بل دھاڑا ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

سلمیٰ نے ایک بار پھر گھبرا کر شیتل کو دیکھا لیکن وہ آنکھیں بند کیے سرمستی میں ڈوبی ہلکورے لے رہی تھی۔ اُس نے دروازے کی جانب پلٹنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔



سلمیٰ سارا دن بدحواس رہی۔ واپس آ کر اُس نے راہول کو بتایا کہ مس شیتل مصروف تھیں اس لیے انہوں نے تصاویر نہیں دیکھیں۔ راہول نے غصے سے تصویریں اُس کے ہاتھ سے چھینیں اور دروازے کی طرف بڑھا۔

”نہیں راہول۔“ سلمیٰ نے بھاگ کر اُس کا راستہ روک لیا۔ ”مت جاؤ راہول، وہ انیل کے ساتھ مصروف ہیں، میں پتا نہیں وہاں کیا کیا دیکھ کر آ رہی ہوں۔“

راہول نے تصاویر واپس رکھ دیں۔ اُس نے گھبرائی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ ”تمہیں کم از کم دروازے پر دستک تو دینی چاہیے تھی۔“

سلمیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دن بدحواسی میں اور رات بے خوابی میں گزری۔ صبح سرخ آنکھیں لیے جب وہ اسٹوڈیوز پہنچی تو راہول نے جیسے اُس کے کانوں کے پاس بم کا دھماکہ کر دیا۔

”دیوی نے تمہیں بلایا ہے، فوری۔“

اور سلمیٰ الٹے پیروں اسٹیج 18 کی طرف چل دی اس بار وہ دروازے پر دستک دیتا نہیں

بھولی تھی۔

”سلمیٰ؟“ اندر سے شیتل کی نفرتی آواز سنائی دی۔ ”اندر آ جاؤ۔“

سلمیٰ نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور اسی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ آج آکاش اسٹوڈیوز میں اس کا آخری دن ہے۔

”بیٹھ جاؤ سلمیٰ۔“ شیتل نے اپنی میک اپ ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے اُسے مخاطب کیا۔ ”خوف

زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”آئی ایم سوری، دیوی۔“ سلمیٰ کی کانپتی اور سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں نے کل جو کچھ دیکھا میں اس پر بے حد شرمندہ ہوں لیکن اپنے ماں باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ

کوئی اس کے بارے میں میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ سنے گا، پلیز مس شیتل، مجھے نوکری سے نہ نکلوائے گا، نہیں وعدہ۔۔۔۔۔“

شیتل نے برش میز پر رکھا اور سلٹی کی طرف مڑی۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ مسکرا دی۔ ”یہ میرا وعدہ ہے، نہیں یا انیل اس واقعے کا کسی سے ذکر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور ہم دونوں تم سے ناراض بھی نہیں ہیں۔“

”آپ۔۔۔ آپ کا مطلب۔۔۔؟“

”ہاں سلٹی۔“ شیتل نے اُس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ”تمہاری نوکری محفوظ ہے لیکن میرے ذہن میں تمہارے لیے ایک اور منصوبہ ہے۔“

”میں ہر طرح سے حاضر ہوں، مس شیتل۔“

”میں راہول سے بات کر کے تمہاری خدمات صرف اور صرف اپنے لیے حاصل کرنا چاہتی ہوں کیا تم میرے ساتھ کام کرو گی؟“

”دل و جان سے دیوی۔“ سلٹی کے منہ سے بے اختیار گہری سانس خارج ہو گئی۔

”کل کچھ نہیں ہوا تھا، آپ مجھے ایک موقع دیں، میں خود کو آپ کی غلام ثابت کر دوں گی۔“

شیتل کے ہونٹوں پر آئودہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”تو پھر ٹری قریب کر لو، ہم باتیں

کریں گے کہ۔۔۔۔۔“

اور پھر وہ دونوں کئی گھنٹے ڈریسنگ روم میں بند رہیں انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔

”اپنی نجی زندگی کے بارے میں بتاؤ سلٹی؟“ شیتل نے سوال کیا۔ ”بوائے فرینڈز،

کوئی خاص دوست وغیرہ؟“

”میری طرف دیکھیں، دیوی، مجھ جیسی موٹی، بھدی اور بد صورت لڑکی کا کوئی بوائے

فرینڈ ہو سکتا ہے؟“

”مستقبل کا کوئی پروگرام؟“

”میں آکاش اسٹوڈیوز میں ہی رہنا چاہتی ہوں، یہ میرا خواب تھا جو پورا ہوا اور اب

مجھے آپ کی خدمت۔۔۔۔۔“

”تمہاری عمر!“

”بائیس سال، دیوی۔“  
 ”میں تیس سال کی ہوں لیکن خود کو سو سال کی محسوس کرتی ہوں۔“ شیتل نے جواب  
 دیا۔

”دیوی۔۔۔!“  
 ”تمہارے لیے میں صرف شیتل ہوں۔“ شیتل نے اُسے ٹوکا۔ ”تم آئندہ مجھے دیوی  
 یا مس نہیں کہو گی۔“  
 ”شکریہ۔۔۔ دے۔۔۔ شیتل۔“

”آؤ میں اب تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں۔“ شیتل نے کہا اور پھر شیتل شروع  
 ہو گئی۔ وادی کشمیر اور سری نگر میں گزرے بچپن سے لے کر ڈرینگ روم کے کیف آگیاں  
 لحوں تک اُس نے کوئی بات نہیں چھپائی۔

”کیا ہم دوست ہیں؟“ اپنی کہانی ختم کرنے کے بعد شیتل نے دریافت کیا۔  
 ”ہاں، شیتل۔“ سلٹی نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔  
 ”ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“

فادر رائے فلیں نے روزنامہ ”پر تپ“ کا تازہ شمارہ میز پر پھیلا یا ہی تھا کہ کیری میلوں اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سالفاہ دبا ہوا تھا۔ کیری نے خاموشی سے لفاہ میز پر رکھا اور اُلٹے قدموں باہر چلی گئی۔

فادر نے لفاہ دیکھا انہیں اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ یہ بحریت کا شاہی لفاہ تھا اور اُن کے نام آنے والا پہلا نہیں تھا۔ ایسے لفاہ وہ پہلے بھی وصول کر چکے تھے۔ انہوں نے اخبار ایک سمت رکھا اور لفاہ کھول لیا۔ جشن سالگرہ میں شرکت کا دعوت نامہ اُن کے سامنے تھا۔ بحریت کی ملکہ اس بار بھی انہیں نہیں بھولی تھی۔ عموماً کرسس، ایسٹر اور نئے سال کے موقع پر ملکہ کے تہنیتی کارڈز انہیں موصول ہوتے رہتے تھے۔ ملکہ نے اپنے تینوں بچوں کی پیدائش کی اطلاع بھی انہیں دی تھی اور ہر بار ریال آنے کی دعوت کا اعادہ بھی کیا تھا لیکن ہر بار فادر نے از خود دعوت منسوخ کر دی تھی کیونکہ وہ ابھی تک دوبارہ اُس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر پائے تھے۔

اس کے باوجود کہ ملکہ بحریت، فادر کی سوچوں سے آگاہ نہیں تھی لیکن وہ ہر عبادت کے بعد اپنے اُس سلوک پر معافی کے خواستگار ہوتے جو انہوں نے اُس خوبصورت اور قابل اعتماد خاتون کے ساتھ کیا تھا جسے وہ شہیلا کلاوتی موہن کے نام سے جانتے تھے۔

بھورے اور ریٹھی بالوں والی بچی نے بچوں کے بل کھڑے ہو کر کوئی دسویں بار ڈور نیل بجائی لیکن اُسے اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ تھک ہار کر وہ وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اندھیرا ہو گیا تھا اور سردی بھی بڑھنے لگی تھی لیکن اُس کی ماں نے اتنی بار گھنٹی بجائے جانے کے باوجود دروازہ نہ کھولا اور اب وہ زمین پر بیٹھی اپنے باپ کی منتظر تھی کہ وہ گھر واپس آئے تو اُسے اندر لے جائے۔

اندھیرا بچوں جوں بڑھتا جا رہا تھا، سردی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ سری نگر کی شامیں یوں بھی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ سکڑتی رہی تاکہ سردی سے بچ سکے لیکن سردی تھی کہ اُس کی ہڈیوں میں سوراخ کرتی جا رہی تھی۔

سردی میں اس طرح ٹھہرنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ شتیلا کلا دتی موہن پہلے بھی اپنی شرابی ماں کے ہاتھوں پٹ کر دروازے کے باہر بیٹھی گھنٹوں روتی اور سردی میں ٹھہرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار ماں، جب وہ اچھی حالت میں ہوتی، اُس کے چہرے پر بوسوں کی جیسے بارش کر دیتی اور کبھی اس بُری طرح مارتی کہ معصوم شتیلا کی جلد تک پھٹ جاتی۔ دن کا زیادہ تر وقت اُس کی ماں سو کر گزارتی اور اُس کے ارد گرد کچی شراب کی ناگوار بو پھیلی رہتی۔ آج بھی شاید ایسا ہی تھا کہ اُس کی ماں نشے میں مدہوش کسی صوفے پر یا فرش پر آڑی تر چھی پڑی ہوگی اور اُسے ہوش بھی نہ ہوگا کہ اُس کی بیٹی اسکول سے واپس آ گئی ہے۔

جانے وہ کب تک یونہی سکوی سٹی بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ اُسے شناسا قدموں کی جانی پہچانی آہٹ سنائی دی۔

”ارے۔“ موہن داس کی حیرت و استعجاب میں ڈوبی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”یہ میری دیوی یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟“

موہن داس نے ڈرائیوروں کی وردی پہن رکھی تھی اور وہ دن بھر سری نگر کی سڑکوں پر

ٹیکسی چلا کر تھکا ماند اور ٹوٹا ہوا گھر واپس آیا تھا۔

”ممتا دروازہ نہیں کھول رہی، پاپا،“ شتیلا نے ٹھٹھری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں، ہم ابھی اپنی دیوی کو اندر لیے چلتے ہیں۔“

موہن داس نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اُسے اندر لے گیا۔

اُس رات موہن داس نے ہی اُسے کہانی سنائی اور اُس نے اُسے سلا یا۔

”فکر نہ کرو، دیوی۔“ کہانی کے اختتام پر موہن داس کی آواز اُسے سنائی دی۔

”تمہاری شادی بھی کسی شہزادے سے ہوگی اور وہ تمہیں اپنی بڑی سی شاہی کچھی پر بٹھا کر لے

جائے گا۔“

شتیلا خاک بھی نہیں سمجھی لیکن موہن داس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے قطرے نکل کر شتیلا کے بھورے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

پھر وہ سو گئی۔ رات کو کسی پہر اُس کی آنکھ کھلی۔ اُسے ماں باپ کے لڑنے کی آوازیں

سنائی دیں۔ پھر شاید پاپا نے ممتا کو مارا بھی تھا کیونکہ وہ حسب دستور رونے اور کوٹنے دینے

بیٹھ گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر دونوں کی تیز تیز آوازیں سنتی رہی اور پھر سو گئی۔ صبح جب سوکر اُٹھی تو

پاپا اپنے کام پر جا چکے تھے۔ اُس نے ماں سے ناشتا مانگا تو ماں نے اُسے بُری طرح مارا اور

گھر سے باہر نکال دیا۔ شاید اُس نے رات خود اپنے کا بدلہ اُس سے لیا تھا۔

شتیلا کچھ دیر تو دروازے پر کھڑی روتی رہی اور پھر سڑک پار کر کے فادر رائے فلین

کے پاس چلی آئی جسے وہ اس دنیا میں پاپا کے بعد اپنا واحد سرپرست اور ہمدرد تصور کرتی تھی۔

فادر رائے فلین، اینگلو انڈین تھے اور جس گرجے میں وہ پادری تھے وہ شتیلا کے گھر کے

عین سامنے واقع تھا۔ شتیلا اکثر و بیشتر ماں کے ہاتھوں ہٹ کر انہی کے پاس پناہ لیا کرتی

تھی۔ اُس کے معصوم ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ اپنے والدین کے مسائل اور لڑائی کی

ذمہ داری دار ہے کیونکہ جب بھی وہ گھر سے باہر بیٹھی پائی جاتی، ممتا اور پاپا میں لڑائی ضرور ہوتی

تھی۔

”تم اپنے والدین کے مسائل کی ذمہ دار نہیں ہو شتیلا۔“ فادر فلین اکثر اُسے

سمجھاتے۔ ”اُن کی لڑائی کی بنیاد تم نہیں، وہ عُربت ہے جو بال کھولے تمہارے کنبے پر نوحہ



کنناں ہے۔“

شتیلا بے چاری کچھ نہ سمجھ پاتی کہ فادر کی ان ثقیل باتوں کا کیا مطلب ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ فادر کی باتیں بڑے غور سے سنتی اور گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھی رہتی۔ ایک روز شام کو موہن داس جب گھر آیا تو اُس نے شتیلا کو بتایا کہ وہ کئی دنوں کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔

”بمبئی سے ایک فلم یونٹ سری نگر آیا ہے۔“ اُس نے اپنی بیٹی کو بتایا۔ ”یونٹ اسٹ ناگ کے آس پاس کسی فلم کی شوٹنگ کرنا چاہتا ہے اور اُس نے پانچ چھ ٹیکسیاں کرائے پر حاصل کی ہیں جن میں ہمیں بھی شامل ہوں۔۔۔ اور دیکھو۔۔۔ تم اب بارہ سال کی ہو گئی ہو، دیوی! تم اپنی دیکھ بھال خود کر سکتی ہو۔ اسکول روزانہ جانا۔ واپس آ کر گھر کے کاموں میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا اور اُس سے بد تمیزی نہ کرنا۔“

شتیلا نے باپ سے اُس کی تمام ہدایتوں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور وہ چلا گیا۔ شتیلا نے ہر ممکن طریقے سے ماں کو خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر روز شراب کے نشے میں ڈھت ہو کر اُسے بُری طرح مارتی اور وہ چیختی چلاتی فادر فلین کے پاس جا کر پناہ لیتی۔

موہن داس نہیں آیا۔ شاید اُس کا کام زیادہ طویل ہو گیا۔ شتیلا بدستور بٹتی رہی۔ روتی رہی اور پھر بہلتی رہی۔ اپنے باپ کی نصیحت کے عین مطابق اُس نے ایک دن بھی اسکول سے چھٹی نہیں کی تھی۔ ماں کے ہاتھوں ہر وقت پٹنے رہنے سے یہ بہر حال بہتر تھا۔ اُس روز وہ دوسہیلیوں کے ہمراہ اسکول سے واپس آتے ہوئے جنوبی اپنی گلی میں داخل ہوئی اُسے اپنے گھر کے سامنے ایک ایسبولینس کھڑی نظر آئی۔ شتیلا وہیں ساکت ہو گئی۔

”اما۔“ چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ چیخی۔ اُسے شاید صورتِ حال کا ادراک ہو گیا تھا۔ ”اما کو کچھ ہو گیا ہے۔“

وہ ایسبولینس کی طرف بھاگی لیکن فادر فلین نے اُسے راستے میں ہی تھام لیا جو اُس کی طرف آرہے تھے۔ انہوں نے اُسے پکڑ تو لیا لیکن وہ خود کو چھوڑا کر پھر ایسبولینس کی طرف بڑھی۔ اُسے کچھ لوگ ایک اسٹریچر اٹھائے گھر سے باہر نکلتے نظر آئے۔ مگر وہ دیکھ نہ سکی کہ اسٹریچر پر کون تھا؟ کیونکہ ایسبولینس کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

وہ اسٹریچر کی طرف بڑھی لیکن کسی نے بازو سے پکڑ کر اُسے واپس کھینچ لیا۔ شتیلا نے پلٹ کر دیکھا وہ اُن کی پڑوسن پشپا تھی۔ ”آگے مت جاؤ، شتیلا، وہ تمہارے دیکھنے کی چیز نہیں۔“

اب آگے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُسے پتا تھا کہ وہ اُس کی ماں ہی ہے۔ سفید اور آل پہنے ہوئے لوگوں نے اسٹریچر اندر رکھا، خود اگلی نشستوں پر بیٹھے اور ایسبولینس سائرن بجاتی چیختی چنگھاڑتی آگے بڑھ گئی۔

شتیلا نے رونا اور پچھاڑیں کھانا شروع کر دیں۔ وہ شرابی تھی، اُسے مارتی تھی، ظلم کرتی تھی لیکن تھی تو اُس کی ماں۔ اُس روز وہ بے تحاشا روئی، اتنا کہ مجموعی طور پر بھی رونا دھونا ملایا

جاتا تو اتنا نہ بنتا۔ بجوم میں سے اُس نے کسی کی آواز بھی سنی کہ چند رما موہن نے خود کشی کی ہے ڈاکٹر نے اُسے سونے کی گولیاں دی تھیں اور وہ انہیں زیادہ مقدار میں کھا گئی تھی۔  
 رفتہ رفتہ لوگ چلے گئے اور وہاں صرف فادر فلین، پشپا اور شتیلا رہ گئے۔  
 ”تم پشپا کے ساتھ چلی جاؤ، شتیلا“ فادر نے اُسے کہا۔ ”میں موہن کو تلاش کر کے اُسے پیغام بھجووانے کی کوشش کرتا ہوں۔“  
 ”فادر۔“ وہ فلین کے قریب کھسک آئی۔ ”میری ماں نے خود اپنے آپ کو مارا ہے؟“

”بے وقوف۔“ فادر نے اُسے جھڑکا۔ ”وہ قدرتی موت مری ہے ڈاکٹر شاسے پوچھ لینا۔“ وہ پھر پشپا سے مخاطب ہوئے۔ ”اُسے لے جاؤ میں موہن کو ڈھونڈتا ہوں۔“  
 چتا جلانے جانے کے اگلے روز اُس کے تینوں بھائی اپنی بیویوں کے ہمراہ اپنے گھروں کو کھسک لیے۔ کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ اب معصوم شتیلا کا کیا ہے گا؟ شتیلا نے بھی اُن سے کوئی بھیک نہیں مانگی بلکہ وہ اپنے چھوٹے سے گھر کی ”کیئر ٹیکر“ بن گئی۔ اب وہ اپنے باپ کے لیے کھانا بناتی۔ صبح اسکول جاتی اور دوپہر کو گھر کی جھاڑ پونچھ کرتی۔ بچپن کی ساری سہیلیاں پچھڑ گئیں تھیں اور سارے کھیل ختم ہو گئے۔ کام سے جب اُسے فرصت ملتی تو وہ فادر فلین کے پاس پہنچ جاتی اور گھنٹوں اپنے ڈکھڑے روتی رہتی۔

موہن داس کو بھی اپنی بیوی کا بے حد دکھ ہوا تھا۔ اُس کی جدائی کا غم بھلانے کے لیے اُس نے شراب پینی شروع کر دی۔ صحت گرنی شروع ہو گئی۔ کام میں بھی اب اُس کا دل نہیں لگتا تھا اور آئے دن وہ کسی نہ کسی چھوٹے بڑے حادثے میں ملوث ہو جاتا تھا۔ ایک آبدھ مرتبہ تو ٹیکسی کے مالک نے اُسے نکالنے کی دھمکی بھی دی تھی کیونکہ وہ ٹیکسی کے نقصانات کی مرمت کراتے کراتے تنک آ گیا تھا۔

موسم گرما آیا اور چلا گیا پھر موسم سرما بھی آ کر ٹھم ہو گیا۔ اُن کا معمول لگا بندھا رہا۔ ایک روز شام کو موہن داس رات گئے تک گھر نہ پہنچا۔ شتیلا اُس وقت تیسری بار کھانا گرم کر رہی تھی جب دروازے پر دستک سنائی دی۔ ساتھ ہی اُسے فادر فلین کی آواز بھی آئی۔  
 اُس نے پچو لہا بھجھایا اور دروازے کی طرف بھاگی۔

”شتیلا“ پادری نے نسبتاً سنجیدہ لہجہ میں اُسے مخاطب کیا۔ ”انہوں نے مجھے فون۔“

”دکس نے؟“ شتیلا نے بے قراری سے پوچھا۔

”تھانے والوں نے۔“

”ایک اور حادثہ؟“

”ہاں، وہ پھر شراب پی کر ٹیکسی چلا رہا تھا۔“

”کیا انہوں نے پایا گو گرفتار کر لیا ہے؟“

”ابھی نہیں۔“

”لیکن وہ کضررولیں گے۔“ شتیلا نے وثوق سے کہا۔ ”ظاہر ہے کوئی اُن کے ساتھ

مسافر بھی۔۔۔“

”وہ تمہا تھا۔“ فادر نے اُسے بتایا۔ ”وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے ٹیکسی چلا رہا تھا۔

شاید اُسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اچانک سامنے ایک درخت۔۔۔“

فادر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کھینچ کر شتیلا کو خود سے لپٹا لیا۔ دونوں

روئے اور خوب روئے، حتیٰ کہ دونوں کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔

”میں پشپا کو کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔“ فادر نے اس سے کہا۔

”اپنا سامان لے لو، اب تم یہاں مت رہنا۔“

”مجھے اپنے ساتھ لے چلیں فادر۔“ ہچکیاں لیتی ہوئی شتیلا نے گزارش کی۔

”چرچ میں ہند نہیں رہ سکتے، بیٹے۔“ فادر نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور

دوسری طرف دیکھنے لگے۔ شتیلا تھوڑی دیر بعد پشپا کے گھر منتقل ہو چکی تھی۔

بھائی اور اُن کی بیویاں دوسری لائھی کو سہارا دینے کے لیے دوبارہ آئیں۔ چتا جلانے

جانے کے بعد فادر نے پہلے الگ الگ تینوں جوڑوں سے ملاقات کی اور پھر انہیں ایک جگہ

اکٹھے بٹھا دیا۔ فیصلہ حقیقتہً تھا، اور شاید مسائل بھی ایک جیسے تھے۔ اُن کا گزارا پہلے ہی مشکل

سے ہوتا تھا۔ بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور تڑپ دار یوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا

تھا۔

شتیلا کو یتیم خانے میں داخل کرادیا گیا۔

بھائیوں اور بھابیوں نے محض ایک ایک بوسہ دے کر اُسے رخصت کیا اور باقی انتظامات فادر فلین کے سپرد کر کے واپس چلے گئے، فادر نے وہ رات اسے پشپا کے گھر رکھا اور اگلے روز خود اُسے یتیم خانے چھوڑ آئے۔

اور سالوں کے بعد یتیم خانے میں پرورش پانے والی شتیلا کملاوتی موہن جو آب ملکہ بحریت شیتل تھی، کا خوبصورت دعوت نامہ اُن کے سامنے پڑا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شیتل کو لکھ دیں گے کہ اب وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں، کام بھی بڑھ گیا ہے اس لیے فی الحال وہ اُن کے ریال آنے پر اصرار نہ کرے۔ پھر شیتل کا خط آئے گا جس میں اُس نے فادر کی خبر گیری کی ہوگی اور یوں معاملہ ختم ہو جائے گا۔

اور اُسی وقت فادر نے کاغذ کا وہ تمبا سا پڑھ دیکھا جو لفافے سے پھسل کر زمین پر جا گر ا تھا۔ انہوں نے پڑھ اٹھایا اور اُسے پڑھنے لگے۔

”پیارے، پیارے فادر فلین!

اس بار آپ کو بہر صورت آنا ہوگا۔ معاملہ اتنا اہم ہے کہ میں جشن شروع ہونے سے پہلے آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ صرف آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں خود آپ کے پاس آتی لیکن شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہو سکے۔ پلیز میری مدد کریں۔ میں جانتی ہوں کہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا لیکن میں اس کی کوشش ضرور کروں گی۔

بہت سی محبتیں۔ آپ کی۔ شتیلا۔“

فادر کے ہاتھ تھر تھرا اُٹھے۔ انہوں نے خط دوبارہ میز پر ڈال دیا اور دیوار پر نگاہیں جما دیں۔ ہو سکتا ہے ماضی میں جھانکنے کا کوئی راستہ ہو صرف شیتل کے لیے ہی نہیں بلکہ ایک بے بس بوڑھے پادری کے لیے بھی۔۔۔

شیتل کا دعوت نامہ انہیں صبح کی ڈاک سے ملا۔ اور جب سوہن ہلک کر نی نے اس کا ذکر وجیتا سے کیا تو اُس نے دعوت نامہ اپنے شوہر کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ جیہی کا غذا کا ایک چھوٹا سا پڑہ لفافے میں سے نکل کر قالین پر جا پڑا۔

دونوں ہچکے لیکن وجیتا نے کا غذا اٹھانے میں پہل کی، وہ شیتل کی تحریر تھی۔  
 ”ایک ہفتہ پہلے آئے گا، ایک طرح سے یہ خاندانی تقریب ہے۔۔۔۔۔“

وجیتا نے پیغام پڑھ کر کا غذا اپنے شوہر کو تھما دیا اور پیار بھری نگاہوں سے اُسے تنکے لگی۔  
 دونوں قابلِ رشک میاں بیوی تھے۔ بلکہ وہ میاں بیوی سے بڑھ کر ایک دوسرے کے دوست یا شاید اس سے بھی آگے کی کوئی چیز تھے۔

یہ محبتیں پہلے دن سے ان کے درمیان قائم تھیں اور آج تک کوئی ان کی بُیا دوں کو ہلانہ سکا تھا۔ اٹھارہ سالہ دلہن وجیتا اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کر کے شوہر کے حوالے کرتی اور پھر سارا دن تنہا بیٹھی اُس کی واپسی کی راہ ہنکتی رہتی تھی۔ رات کو جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو وجیتا چودھویں کے چاند کی طرح جی سنوری اُس کا استقبال کرتی۔ اُس کے جوتے اور موزے اُتارتی۔ اُسے کھانا کھلاتی اور اپنی زلفوں کے چھاؤں تلے سلاتی۔

کہتے ہیں آدی گھر سے مطمئن ہو تو دنیا بھی اس کے قدم چومتی ہے، سو، سوہن ہلک کر نی کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ وہ تیزی سے بلند ہوا اور شادی کے پہلے ہی سال اپنے کریو کا فورمین بن گیا۔ بعد ازاں اُس نے اپنی ٹھیکیداری کی فہم بنائی اور کامیابی کا سفر طے کرنے لگا۔  
 اخبارات اُسے ”شہنشاہ تعمیرات“ لکھتے اور رپورٹر اُسے ”انجینئر سوہن“ کے نام سے پکارتے۔

چند ہی سالوں میں نیم منجھتہ گھر میں بیاہ کر آنے والی وجیتا ایک عالی شان بنگلے کی مالک بن گئی۔ سوہن پیسہ کماتا اور وہ لٹاتی، لیکن مجال ہے کبھی شوہر نے بیوی سے پوچھا بھی ہو کہ اتنا



پیسہ کہاں چلا جاتا ہے۔ اللہ نے انہیں سب کچھ دیا تھا لیکن ایک نعمت ایسی تھی جس سے اُس نے انہیں محروم رکھا تھا۔ اور وہ تھی اولاد۔ انہوں نے بمبئی سے دہلی تک کوئی ڈاکٹر، حکیم، وید نہیں چھوڑا تھا۔ بھارت کے بڑے بڑے مندروں میں وہ دیے جلا آئے تھے لیکن وجیتا کی گود ہری ہونا تھا نہ ہوئی۔

وجیتا کو ممکن ہے اس کا ذکر ہا ہو لیکن سوہن نے کبھی اپنے منہ سے اس کا اظہار نہ کیا۔ وجیتا کی بہن چندر ما اور اُس کے شوہر موہن داس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں انہی سے دل بہلاتے۔ موہن اور چندر ما اُن سے سینکڑوں میل دور سری نگر میں تھے لیکن سوہن اور وجیتا سال میں دو تین بار وہاں ضرور جاتے اور کئی کئی دن اُن کے ہاں مقیم رہتے۔

موہن اور چندر ما کے بیٹے بڑے اور بیٹی چھوٹی تھی۔ دونوں نے بڑی مشکلوں سے بیٹوں کو پالا لیکن تینوں ہی گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے انہوں نے اپنی مرضی سے شادیاں کیں اور والدین کو کبھی پلٹ کرنے پوچھا۔ وہ اور اُن کی بیویاں موہن داس کو تو کسی حد تک پسند کرتے تھے لیکن چندر ما انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

اُن کے برعکس سب سے چھوٹی شتیلا کملاوتی ایک خاموش طبع لڑکی تھی۔ ماں کے ہاتھوں مار کھا کر بھی وہ اُس سے بے تحاشا پیار کرتی۔ بخورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گوری چٹی شتیلا چینی کی کوئی گڑیا لگتی تھی۔ وجیتا اور سوہن اُسی سے ملنے سری نگر جاتے۔ دیوالی، ہولی وغیرہ کے علاوہ بھی وہ ہر تہوار پر اُسے کپڑے، کھلونے اور بہت سے خفے روانہ کرتے رہتے تھے۔

جب چندر ما، بھگوان کو پیاری ہو گئی تو وجیتا نے اپنے بہنوئی کو پیش کش کی کہ وہ شتیلا کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لے جس کے اخراجات خود وہ برداشت کرے گی لیکن موہن داس نے حامی نہیں بھری۔ شتیلا نے خود بھی اپنے باپ کی ہاں میں ہاں ہی ملائی تھی۔

کچھ عرصے بعد جب ایک حادثے میں موہن داس چل بسا اُس وقت سوہن اور وجیتا یورپ کی سیر کو گئے ہوئے تھے واپسی پر انہیں فادر فلین کا ایک خط ملا جس میں اُس نے انہیں فوری طور پر سری نگر پہنچنے کا لکھا تھا۔

دونوں نے فون پر صورت حال معلوم کی اور پھر پہلی پرواز سے سری نگر پہنچ گئے۔

”شتیلا ہمیشہ یتیم خانے میں نہیں رہ سکتی۔“ فادر فلین نے انہیں آگاہ کیا۔ ”لڑکوں سے ساری اُمیدیں ختم ہو گئی ہیں اور اب تم دونوں بچے ہو جنہیں میں شتیلا کا آخری سہارا سمجھتا ہوں۔“

دونوں خاموش رہے تھے۔

”کیا دہلی کے ایک نامور اور کروڑ پتی ٹھیکیدار سوہن گلکرنی اور شہر کی مشہور سماجی رہنما اور دہلی چلڈرن فنڈ کی صدر وجیتا گلکرنی کی بھانجی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یتیم خانے میں رہے گی جو لوگوں کی خیرات سے چلتا ہے۔“ فادر فلین نے چپھتے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں، میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔“

اگلے دن شتیلا کماؤتی موہن، اپنی خالہ اور خالو کے ہمراہ دہلی پرواز کر گئی۔

انہوں نے اپنے بڑے سے گھر میں اُسے ایک الگ کمرہ دیا۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں داخلہ دلوایا اور اُس کے لیے لاتعداد کپڑے سلوائے۔ ساتھ ہی انہوں نے اُسے اپنی متنبی بنانے کے لیے ایک وکیل کا انتظام کیا۔ متنبی بنائے جانے کی کارروائی کو کسی نے چیخ نہیں کیا اور آخری روز شتیلا کماؤتی موہن جب عدالت سے باہر آئی تو اسے نیا باپ، نئی ماں اور نیا نام مل چکا تھا۔

اب وہ شیتل گلکرنی تھی۔

نیا گھر، نئے والدین، نیا نام اور نیا ماحول پاکر شیتل کی ساری شوخی جیسے رُخصت ہو گئی۔ وہ خاموش رہنے لگی۔ سوہن اور وجیتا آپس میں چہلیں کرتے رہتے اور وہ چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی یا ہوم ورک کرتی رہتی۔ اُس نے کبھی ضرورت سے زیادہ بات نہ کی اور نہ ہی کبھی اپنی خالہ اور خالو کو تنگ کیا تھا۔

لیکن وہ دونوں شیتل سے تنگ ضرور تھے۔ انہوں نے اپنی شادی کے ابتدائی سال ایک تنہا گھر میں گزارے تھے۔ پھر بڑے بڑے اور تنہا گھر میں، میاں بیوی کے رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شیتل تو بدل گئی لیکن سوہن اور وجیتا خود کو نہ بدل سکے۔ اُن کی محبتوں تلے اظہار کا ایک الگ ڈھنگ تھا اور وہ اُسے تبدیل کرنے کو تیار نہ تھے۔ گھر میں رہنے کے باعث شیتل بھی یہ سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی تھی لیکن اُس نے کبھی اس کا اظہار

نہیں کیا تھا۔

شیتل نے رات کا کھانا بھی اپنے کمرے میں کھانا شروع کر دیا تا کہ دونوں پاگلوں کو کھل کھیلنے کا خوب موقع مل سکے۔ وہ اسکول سے آ کر سیدھی پونم کے ہاں چلی جاتی اور شام کو گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ پھر وہ اگلے روز صبح ہی برآمد ہوتی تھی۔ سوہن اور وجیتا اس معمول سے خوش تھے۔ اُن کی بلا سے وہ بھاڑ میں جاتی، کم از کم اس طرح وہ اُن کی حرکتوں اور کرٹوتوں میں نخل تو نہ ہوتی تھی۔

oo

سوہن اور وجیتا نے دو سال تک یہ سب برداشت کیا، حتیٰ کہ شیتل چودہ سال کی ہو گئی۔ وجیتا نے شیتل کو بمبئی کے ونڈر سر مشنری کالج میں داخل کرانے کی تجویز پیش کی تو سوہن نے بلا جھجک اسے مان لیا۔ شیتل کو بھی بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُس کے لیے دہلی کا یہ گھر اور بمبئی کا ونڈر سر ہاسٹل ایک سے ہی تھے۔

خزاں کے بعد سوہن اور وجیتا، شیتل کو لے کر بمبئی پہنچ گئے۔ داخلے کے انتظامات پہلے ہی کیے جا چکے تھے۔ انہوں نے خود شیتل کے لیے ہاسٹل کا کمرہ منتخب کیا جس میں ایک سخت قسم کا دیوار گیر بستر اور فرش لکڑی کا تھا۔ اس کے بعد وہ کالج کے انگریز پرنسپل ہیرالڈ رسکن سے ملے جس کی تین نسلیں بھارت میں ہی پیدا ہوئی تھیں اور اب وہ خود بھی ننانوے فیصد بھارتی ہو چکا تھا۔

”شیتل ایک اچھی لڑکی ہے۔“ وجیتا نے پرنسپل کو آگاہ کیا۔ ”ہمیں اُمید ہے وہ کسی شکایت کا موقع نہ دے گی۔“

اور ایسا ہوا بھی نہیں۔ شیتل اپنی کلاس کی ذہین ترین طالبہ کی حیثیت سے سامنے آئی۔ اُس نے امتحانوں میں ہمیشہ اے گریڈ لیا۔ گھر سے ملنے والی رقم سے کبھی فضول خرچی نہ کی۔ کالج کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کے خیال میں وہ تہذیب و شائستگی کا ایک نادر اور مثالی نمونہ تھی۔

کوئی ایک سال سکون سے گزرا لیکن پھر مسائل کا پہلا تھیٹر اسوہن اور وجیتا کے منہ پر پڑا۔ وہ اُس وقت گھر سے نکل رہے تھے کہ فون کی گھنٹی نے دروازے پر اُن کے قدم جکڑ لیے سوہن نے ریسیور اٹھالیا۔

”ہم نے اُسے پکڑ لیا ہے۔“ دوسری طرف سے ونڈر سر مشنری کالج کے پرنسپل ہیرالڈ رسکن کی آواز سنائی دی۔ ہمیں شک ہے کہ یہ عرصے سے ہو رہا تھا مگر ہم اسے ثابت نہیں کر

سکتے۔“

”لغت ہو۔“ سوہن دھیرے سے بڑبڑایا پھر تیز آواز میں بولا۔ ”پہیلیاں مت  
 بُجھوائیں مسٹر رسکن، جلدی بولیں، کیا ہوا ہے، میری فلائٹ ٹکلی جا رہی ہے۔“  
 ”ہمارے ایک ٹیچر نے اُسے رات کے وقت اپنے کمرے میں ایک لڑکے کے ساتھ  
 قابل اعتراض حالت میں پکڑا ہے۔“

”کیا بکواس ہے؟“ سوہن غرایا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، لڑکی کی تربیت نہایت  
 شریفانہ اور صاف ستھرے ماحول میں ہوئی ہے اور تم کہہ رہے ہو اُس نے ہماری ناک کٹوا  
 دی۔“

”ٹھنڈے دل سے سوہن۔“ وجیٹا کی آواز اُبھری۔ اُس نے ایکسٹینشن کارپوریٹس  
 کرکانوں سے لگا رکھا تھا۔ پھر وہ پرنسپل سے مخاطب ہوئی۔ ”اس خبر کو باہر نہیں جانا چاہیے مسٹر  
 رسکن، ہمیں خواہ مخواہ کی بدنامی مول لینا چاہتی۔“  
 ”ہمیں کالج کے نام کی لاج بھی رکھنی ہے مسٹر ملکر نی۔“ رسکن کی آواز آئی۔ ”آپ  
 بے فکر رہیں، خبر باہر نہیں جائے گی اور نہ ہی ہم شیتل کو کچھ کہہ رہے ہیں۔ ذاتی طور پر ہمیں  
 شیتل اور ہاسٹل کی وارڈن سے بھی بات کر چکا ہوں۔“

”تو پھر تم ہمیں پریشان کیوں کر رہے ہو؟“ سوہن دہاڑا۔  
 ”لڑکی کے والدین کی حیثیت سے۔“ رسکن نے جواب دیا۔ ”ہمارے خیال میں یہ  
 بات آپ کے علم میں ہونی چاہیے، آخر وہ آپ کا بھی تو مسئلہ ہے۔“  
 ”ہمارا مسئلہ؟“ سوہن پھر غُرغُرایا۔ ”ہم سینکڑوں میل دُور بیٹھے ہیں وہ تمہارا مسئلہ ہے۔“  
 ”وہ آپ کی بیٹی ہے، مسٹر سوہن۔“  
 ”ہاں۔۔۔ لیکن اُس کے اخراجات کون دے رہا ہے؟“  
 ”آپ سر۔“

”تو آئندہ یہ بات ذہن میں رکھنا۔“ سوہن نے جھٹّا کر کہا اور فون بند کر دیا۔

شیتل گرمیوں کی تعطیلات میں جب گھر پہنچی تو اُس سے قبل اسی طرح کے تین ٹون آچکے تھے۔ پہلے کا نام زسکن نے جگدیش بتایا تھا جب کہ بعد والے تینوں کا نام درما۔ گوپی اور یشپال تھے۔

سوہن اور وجیتا نے بگڑے ہوئے چہروں اور بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اُس کا استقبال کیا۔ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ وہ شیتل سے اس مسئلے پر زیادہ بات نہیں کریں گے لیکن اُسے یہ احساس ضرور دلائیں گے کہ اُس نے اُن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ انہوں نے یہ کہا بھی لیکن کار کی عقبی نشست پر اکیلی بیٹھی ہوئی شیتل خاموش رہی۔ اگلے روز اُس نے سری نگر جانے اور فادر فلین سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور سوہن نے بغیر کچھ کہے اُس کے جانے کے انتظامات کر دیے۔

فادر نے بڑی گرم جوشی سے اُس کا استقبال کیا۔  
 ”میں آپ سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں فادر۔“ کافی کا کپ ہاتھ میں لے کر شیتل گویا ہوئی۔

”وہ تو تم ہمیشہ کرتی رہی ہو۔“ فادر نے مسکرا کر جواب دیا۔  
 ”اُن کا کہنا ہے کہ میں ان کی نظروں سے گزرنے والی سب سے بڑی گناہ گار ہوں۔“ شیتل نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔  
 ”یہ تمہیں کس نے کہا ہے؟“

”آئی ویتا اور انکل سوہن نے، انہوں نے مجھے کسی صفائی کا موقع نہیں دیا۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ بہت سے لڑکوں کے ساتھ میرے تعلقات ہیں لیکن آئی ویتا اور انکل کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ خبریں ادھر ادھر پھیلیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”مگر وہ مجھے اس سے روک نہیں سکتے۔ میں وہاں ایسا کرنے والی اکیلی تو نہیں، لیکن پکڑی جانے والی اکیلی

بدقسمت ہوں۔“

”یہ سب کیوں کرتی ہو، تم؟“ فادر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”تاکہ پکڑی جاؤں۔“ شیتل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ انکل، آنٹی، پورے بھائی اور پورے دہلی کو اس کا پتا چل جائے۔ سب کو پتا چل جائے کہ کوئی مجھے چھوٹا ہے، کسی کو میری ضرورت ہے خواہ نصف گھنٹے کے لیے ہی کیوں نہ ہو؟“ اُس نے کندھے اُچکا ئے۔ ”لڑکے ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ میرا حصول بے حد آسان ہے۔ آپ کو پتا ہے تاکہ باتیں کتنی تیزی سے سفر کرتی ہیں اور پھر اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟“

”شتیلا، ہم تمہارا کیا کریں؟“ فادر نے زچ ہو کر کہا۔

”مجھے لیکچر دینے یا ڈرانے کی کوئی ضرورت نہیں فادر۔“ شیتل نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ کوئی مجھے چھوئے۔“ اُس نے نظریں جھکا لیں اور معذرتی انداز اختیار کر لیا۔ ”مجھے معاف کر دیجئے گا فادر، میں جو کچھ کر رہی ہوں، وہ آپ کی یاد دوسروں کی نظروں میں کتنا بھی مکروہ کیوں نہ ہو لیکن میرے لیے باعثِ اطمینان ہے۔“ اُس کا لہجہ پھر بدل گیا۔ ”جب میں لڑکوں کو ہڈ جوش کر دیتی ہوں تو وہ حصولِ تسکین کے لیے پاگل ہو جاتے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر جاسکتی ہوں یا وہ کچھ انہیں دے سکتی ہوں جن کی انہیں ضرورت ہوتی ہے وہ میرے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، میرے فیصلے کے محتاج ہوتے ہیں۔ مجھے اُن پر قدرت اور قوت حاصل ہوتی ہے اور میرے لیے یہ سب بہت باعثِ تسکین ہے۔“

فادر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”تم تنہائی کا شکار ہو شتیلا۔“ بالآخر انہوں نے فیصلہ سنایا۔ ”کچھ ہی دنوں تک تم بڑی ہو جاؤ گی اور پھر بہت سے لوگ تم سے محبتیں جتائیں گے، وہ اس قابل بھی ہوں گے کہ تم اُن سے محبت کرو، اُس وقت تک کے لیے صبر کرو اور یہ کھیل کھیلنے بند کر دو۔۔۔ وقت کا انتظار کرو۔ اُس سے پہلے اپنے آپ کو تباہی اور بدنامی کے گڑھے میں مت دھکیلو۔“

شیتل کندھے اُچکا کر اٹھ گئی۔ فادر نے اُسے مزید کچھ نہیں کہا البتہ انہوں نے خود ونڈر سرکالج کے پرنسپل سے بات کی۔ چنانچہ شیتل چھٹیاں گزار کر جب واپس بمبئی پہنچی تو مسٹر زسکن اس کے لیے ایک مصروف شیڈول لیے اُس کے منتظر تھے۔ مزید تباہی سے بچانے کے

لیے اُسے ٹینس، گھڑ سواری اور دیگر دلچسپیوں میں حصہ لینے کی ہدایت کی گئی۔ کھیلوں کے ساتھ ساتھ وہ جدید رقص اور اداکاری کی تربیت بھی لینے لگی۔  
وئڈسر کے باقی سالوں میں اُس کی کوئی شکایت نہ ملی اور نہ ہی وہ کبھی کسی لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی۔

دلیپ راج نامی ایک اُستاد اُسے اداکاری سکھایا کرتا تھا۔ وہ آکاش اسٹوڈیوز کے قریب ہی رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ اُستاد ہی رہا لیکن پھر وہ شیتل کا محبوب بن گیا اور وہ گرجویشن تک اُسی کی وفادار رہی۔

اُس کے رویے کے پیش نظر سوہن اور وجیتا نے بھی اُس کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد شیتل دہلی تو کئی مرتبہ گئی لیکن فادر فلین کو اُس نے نظر انداز کر دیا۔  
اور اب کئی سالوں بعد سوہن اور وجیتا کو بذریعہ ڈاک اُس کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔

”بھلا کسے یقین ہوگا کہ سری نگر کے ایک غریب نیکی ڈرائیور موہن داس اور غریب لیکن شرابی ماں چندرما کی بیٹی ایک ملکہ ہے۔“ وجیتا نے کوئی سوویں مرتبہ کہا۔  
”ہماری بیٹی۔“ سوہن نے اپنی بیوی کی تصحیح کی اور آگے بڑھ گیا۔



انیل کمار، اپنے عالی شان بنگلے کی بالکونی میں کھڑا سمندر کی دُور نظر آنے والی لہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ذرا دیر پہلے ہی اپنے بیڈ روم کے ساتھ جدید ترین آلات سے مزین جیمخانے میں ایک گھنٹے کی ورزش سے فارغ ہوا تھا اور اب وہ ریتلے ساحل پر جو گنگ کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

پچپن سال کا ہونے کے باوجود انیل کا جسم اب بھی اُسی قدر خوبصورت اور مضبوط تھا جتنا فلم انڈسٹری میں وارد ہونے کے ابتدائی دنوں میں ہوا کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنا موازنہ دائیں جانب کے پڑوسی شتر و گھن سنہا سے کیا کرتا تھا جس کا جسم بھی اُس کی طرح مضبوط اور کسا ہوا تھا لیکن وہ عمر میں بھی تو اُس سے چھوٹا تھا۔ دوسری جانب راجندر تھا۔ وہ بھی کم وبیش اُسی کا ہم عمر تھا لیکن اُس کا جسم اب مضبوط نہیں رہا تھا۔

انیل نے چند لمحوں کے لیے اپنا اور راجندر کا موازنہ کیا۔ بے شک اُس کا جسم ڈھل گیا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ راجندر اب بھی ٹاپ کلاس ہیرو تھا جب کہ انیل ماضی کا فسانہ ہوا چاہتا تھا۔

ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ وہ سوال تھا جو انیل نے کئی مرتبہ خود سے اور اپنے میجر سے کیا تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں ایسے دن بھی آئیں گے جب لوگ اُس کے نام کے ساتھ ”ہے“ کے بجائے ”تھا“ لگائیں گے۔ اُس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن آخر دوسرے بھی تو تھے۔ دلپ کمار، پران، راج کپور، راج کمار اور پھر راجندر مگر یہ سب صرف اُسی کے ساتھ کیونکر ہوا، کسی اور کے ساتھ کیوں نہیں ہوا؟

کل سے وہ اس سوال پر زیادہ شد و مد سے غور کر رہا تھا۔ ڈاکے نے جو روزانہ اُس کی ڈاک گیٹ کے باہر لگے لیٹر باکس میں ڈالتا تھا یہ طور خاص ڈورنیل بجا کر اُسے باہر بلوایا اور

پھر ایک خوبصورت سالفافہ ذاتی طور پر اُسے تھمایا جس پر شاہی مہر ثبت تھی۔ یہ کوئی دعوت نامہ لگتا تھا اور بحریت سے آیا تھا۔

انیل اُسے ڈاکے کے سامنے کھول کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا اس لیے لفافہ اندر لے آیا۔ لفافہ کھولتے ہی وہ حیرت سے اچھلا۔ وہ واقعی دعوت نامہ تھا۔ اور ساتھ شیتل کی اپنی تحریر میں لکھا ہوا ایک مختصر سا پیغام بھی۔

”اتو، ڈیر۔“ خط کا آغاز اس نام سے ہوا تھا جس سے انیل کو پوری دنیا میں سوائے اُس کے کوئی اور نہیں پکارتا تھا۔

”پندرہ سال بیت گئے اور ہمیں پتا بھی نہ چلا۔ اس کے باوجود کہ ان سالوں میں ہمارے درمیان بہت کچھ ہوا اور شاید ہم بہت بدل بھی گئے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمہاری دوستی میں آج تک نہیں بھول سکی۔ میں اپنے اسی دوست کو بحریت آنے کی دعوت دے رہی ہوں۔ میں تم سے مستقبل کے کچھ منصوبوں پر بات کرنا چاہتی ہوں اس لیے براہ کرم تقریبات کے آغاز سے ایک ہفتہ قبل پہنچ جانا۔

تمہاری مخلص: شیتل۔“

”مخلص۔“ کا لفظ اُسے نامانوس سا لگا۔ وہ چند لمحے اس پر غور کرتا رہا لیکن پھر اُس نے

کندھے جھٹک کر گویا اس لفظ کو بھی جھٹک دیا۔ ممکن ہے پر وٹو کول کا کوئی مسئلہ رہا ہو؟ اُس کی صبح تو شیتل کے دعوت نامے کی نذر ہو گئی تھی لیکن اُس نے رات کی رنگینی کو سنگینی میں نہیں بدلا۔ معمول کے مطابق ایک نئی لڑکی اُس کی مہمان بننے کو آئی تھی۔ عُمر اس کی کوئی بیس اکتیس سال تھی لیکن تھی ظالم بلا کی خوبصورت۔۔۔ جسم یوں سانچے میں ڈھلا ہوا تھا جیسے اللہ نے اُسے بڑی فرصت میں بنایا ہو۔ وہ اُس سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر لڑکی کا نام اور پتا اُسے یاد رہ گیا تو وہ دوبارہ اُسے ضرور بلوائے گا۔

نصف شب سے ذرا بعد انیل نے لڑکی کو جانے کے لیے کہا تو اُس نے بُری طرح احتجاج کیا۔ بقول اُس کے یہ وقت اُس کے اکیلے جانے کا نہیں تھا لیکن ظاہر ہے انیل کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اُس نے تیاری کے لیے لڑکی کو زبردستی ڈرینگ روم میں

دھکا دے دیا۔

”میرا نام نزل ہے۔“ لڑکی نے اندر سے یہ آواز بلند بتایا۔ ”ہم لوگ سری نگر کے رہنے والے ہیں لیکن اب بمبئی میں ہی مقیم ہیں۔ میرا نمبر۔۔۔“

وہ جانے کیا کچھ کہتی رہی لیکن انیل اب وہاں کہاں تھا اُسے تو کشمیر کی ایک اور کھلی یاد آگئی تھی جس کا نام تھائیتل گلکرنی اور دُنیا سے چینی کی گڑیا اور دیوی کے نام سے پُکارتی تھی۔

دیوی تو ماضی کا قصہ تھی جس نے اُس کی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے لیکن وہ حال میں بھی اُس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی بابت سوچ رہا تھا۔ عیارا نیل نے دعوت نامہ ملنے کے بعد کوئی دس بار اپنے پریس سیکرٹری سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن ہر بار وہ دستیاب نہ تھی۔ اس کے پاس روزنامہ ”دراکٹی“ اور ”دی بمبئی رپورٹر“ کے لیے ایک دھماکا خیز خبر موجود تھی۔

انیل کو یقین تھا کہ فلمی دُنیا کے ان دو ٹاپ کلاس جریڈوں میں جب یہ خبر چھپی گی کہ اُسے بحریت سے شاہی دعوت نامہ موصول ہوا ہے تو پڑھنے والوں کو پتا چلے گا کہ انیل اب بھی ایک بین الاقوامی شخصیت ہے وہ دعوت نامے سے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنا چاہتا تھا، رہ گئی شیتل، تو اسے ایک ہفتے بعد بھی مطلع کیا جاسکتا تھا کہ اُس نے دعوت نامہ قبول کر لیا ہے۔

نزل تیار ہو کر باہر نکل آئی۔ انیل نے اسے ڈرائیور کے ساتھ رخصت کیا اور خود بستر پر لیٹ کر وہ دن رات یاد کرنے لگا جو اُس نے شیتل گلکرنی کی معیت میں گزارے تھے۔

سنہری شیتل، مقدس اور انوکھی شیتل، چینی کی گڑیا، الگ تھلگ، مہذب، خوش اخلاق، اور ٹھنڈے مزاج کی شیتل جو کئی بار بھارت کا سب سے بڑا فلمی ایوارڈ ”شری پدم ایوارڈ“ اور ”گاندھی ایوارڈ“ جیتنے کے بعد بھی مغرور نہ ہوئی تھی۔

آغاز ہی سے اس کے طور طریقے اور رہن سہن بے حد شاہی قسم کے تھے۔ اُسی زمانے میں ہی فلمی رپورٹرز اُس کے بارے میں وہ تمام الفاظ لکھا کرتے تھے جو تعریف و توصیف کے حوالے سے ڈکشنری میں دستیاب تھے۔ آکاش اسٹوڈیوز کے اُس وقت کے ہیڈ، آدی نارائن نے اُسے اسٹیج سے اپنے اسٹوڈیوز میں لانے کے لیے اُس کی منہ مانگی قیمت ادا کی تھی۔ اُس کے منجبر نے جو مطالبہ کیا تھا اُسے فوری طور پر پورا کیا گیا۔ وہ جب چاہتی اسٹوڈیوز چھوڑ کر اسٹیج کی دنیا میں واپس جاسکتی تھی۔ اُسے جو ہو میں علاقے کی شاندار ترین کوٹھی رہائش کے لیے پیش کی گئی جس کے تمام اخراجات آکاش اسٹوڈیوز نے ادا کیے۔ اُسے آکاش کی جس فلم میں سائن کیا جاتا اُس کے اسکرپٹ ڈائریکٹر اور ہیرو تک کی منظوری وہ خود دیا کرتی تھی۔

اُس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ آدی نارائن انرپورٹ سے اسٹوڈیوز۔۔۔ اور اسٹوڈیوز سے گھر تک اُس کی کار خود رانیو کیا کرتا اور وہ ملکہ کی شان سے عقبی نشست پر براجمان ہوتی تھی۔ آدی نارائن کردار کے تقاضوں کے سوا اُس کے سامنے کبھی بلند آواز میں بات تک نہ کرتا تھا۔

انیل کمار جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اُسے بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس طرح اس نے اپنی ہیروئن بننے والی ہر لڑکی کو کیا تھا۔

خود انیل کمار کسی سے کم نہ تھا۔ اُس نے آج تک بھارت کی فلم انڈسٹری میں سب سے زیادہ معاوضہ پانے والے اداکار کا اعزاز حاصل کیا تھا اُس کے پاس جو ہو میں پانچ ایکٹر پر

پھیلی ہوئی عالی شان کوٹھی تھی اس کے دو بیٹے سیندھرسٹ میں فوجی تربیت پارہے تھے دو لڑکیاں بمبئی کے بہترین اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ اُس کی بیوی، دُنیا ئے فلم کی سابق رقاصہ ریتا کو لامحدود سہولتیں حاصل تھیں اور اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بار جو ساڑھی باندھ لیتی تھی دوبارہ کبھی نہیں باندھتی تھی۔ ان سہولتوں کے پیش نظر اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فلمی دُنیا کی ہر نئی ہیروئن اُس کے شوہر کے کالر کا پھول کیوں بنتی ہے؟ انیل نے آدی نارائن سے کبھی درخواست نہیں کی کہ وہ اُسے شیتل ملکر نی کے مقابل کا سٹ کرے وہ اس انتظار میں تھا کہ خود شیتل اُس کی جانب بڑھے۔ لیکن اپنی اس بے اعتنائی کے باوجود وہ شیتل سے بے خبر نہ تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے سائے کی طرح اُس کے ساتھ تھا اور اُس کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اُن دنوں بھارت میں دلیپ کمار کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ لیکن شیتل کے بارے میں اُس وقت بھی کوئی افواہ سننے کو نہ ملی جب اُس نے دلیپ کمار کے مقابل اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم ہیوں نے دلیپ اور شیتل کی جوڑی کو ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن انیل کو یقین تھا کہ دلیپ اور شیتل کی قربت نے کوئی ٹھل نہ کھلایا ہوگا کیونکہ دلیپ ان دنوں پری چہرہ نسیم کی بیٹی سائرہ بانو کے ہو چکے تھے اور اسی کی محبت میں گرفتار تھے۔

ایک دن آدی نارائن نے اُسے ”سائے“ نامی فلم کا اسکرپٹ روانہ کیا۔ اس میں انیل کمار کو مشہور رومانی کردار رانجھا کے لیے منتخب کیا گیا جب کہ ہیرا کا کردار شیتل کو ادا کرنا تھا۔ انیل نے اسکرپٹ دیکھا اور اُسے پڑھے بغیر ایک طرف پھینک دیا۔ کئی دن بعد جب آدی نارائن نے بہت انتظار کے بعد اُسے یاد دہانی کے لیے فون کیا تو اُس نے بڑی بے نیازی سے آکاش اسٹوڈیوز کے سربراہ کو بتایا کہ اُسے ابھی اسکرپٹ کے مطالعے کی فرصت نہیں ملی اور پڑھنے کے بعد ہی وہ سوچ کر جواب دے گا۔ اور پھر کئی روز تک اُس نے آدی نارائن کو گولگو کی کیفیت میں لٹکائے رکھا۔

شوٹنگ سے پہلے آدی نارائن کی بیوی پرکاشا نارائن نے ایک ”دوستانہ ڈنر“ کا اہتمام کیا تاکہ آدی کی نئی فلم ”سائے“ کے تمام اداکاروں کا ایک دوسرے سے تعارف ہو سکے۔ پرکاشا ایک منجھی ہوئی میزبان تھی اُس نے انیل کو اپنی دائیں جانب اور شیتل کو انیل کے

ساتھ دائیں جانب بٹھایا۔ سامنے آدی نارائن کی دائیں جانب انیل کی بیوی ریتا اور اس کے ساتھ شیتل کا محافظ ہدایت کار آر کے پی بیٹھا تھا جسے انیل نے کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔

کھانے کے دوران شیتل نے اُس سے بات چیت تو کی لیکن اُس کے انداز میں ایک عجیب قسم کی سرد مہری تھی جسے انیل محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ فوری طور پر غور کرنے لگا کہ کیا وہ کبھی شیتل کی سرد مہری ختم کرنے اور اسے حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ شوٹنگ کا پہلا ہی دن انیل کے لیے ایک امتحان سے کم نہ تھا۔ بد معاش آر کے پی نے اُن پر ایک خالص اور جذباتی رومانی سین فلمایا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آئے تو انیل خاصا نروس تھا۔ وہ سین کے تقاضوں کے مطابق شیتل کو قریب کرنے سے ڈر رہا تھا لیکن اُس وقت اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شیتل مُنہ زور ہوا کا وہ جھٹکوں بن گئی جو چھوٹے سے روشن دان سے گزرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ انیل اس ردِ عمل کے لیے تیار نہ تھا۔ اُس نے اپنی حیرت پر قابو پانے کے لیے ٹھکا لگنے کا بہانہ کیا اور اپنے ڈائلاگ بولنے کے بجائے پانی کا گلاس طلب کر لیا۔

کیرے کی آنکھ سے لپٹے آر کے پی کو کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی اور اُس نے ری ٹیک کا حکم دے دیا۔ سین اوکے ہو گیا۔ اور پھر سارا کام معمول کے مطابق ہونے لگا۔ شیتل نے اس دوران کبھی پہلے سین کی بابت کوئی بات نہ کی اور نہ ہی کبھی اُس کے کسی انداز میں انیل کو کوئی دعوت محسوس ہوئی بلکہ وہ ہمیشہ مہذب اور شائستہ ہی رہی۔

انیل نے بھی خود اُس کی طرف بڑھنے کی کوئی کوشش نہ کی اُس کے تجربے نے اُسے بتایا کہ فریق مخالف بھی بے قرار ہے بس وہ گوگو کی کیفیت میں ہے۔ ہر روز شوٹنگ کے اختتام پر وہ اسٹوڈیوز کے پروجیکشن روم میں شیتل کے برابر بیٹھ کر رش پرنٹ دیکھتا۔ بلا مُبالغہ اُسے شیتل کی اداکاری بے حد پسند آتی تھی۔ لیکن اس پسند میں شیتل کے حُسن اور عشوہ طرازیوں کو کوئی دخل نہ تھا۔

کبھی کبھار وہ لنچ بریک اُس کے ”اسٹار بنگلو“ میں گزارتا۔ اور بعض اوقات انیل اپنی اسپورٹس کار میں خود اُسے شوٹنگ کے لیے لے جاتا، یہ اس وقت ہوتا جب شیتل کا ڈرائیور

بیمار ہوتا یا کسی اور وجہ سے شیتل کو اتنی سویرے شوٹنگ پر لے جانے سے قاصر رہتا تھا۔ اُس نے کبھی انیل کو انتظار نہ کرایا بلکہ ہمیشہ ہی اُسے اپنے بنگلے کے باہر گیٹ پر کھڑی ملتی۔ صبح سویرے اس حسین قتالہ کو دیکھ کر جانے انیل کا دل کیا کیا کہتا لیکن وہ زبردستی دل کو تھپتھپا کر سلا دیتا۔

جوں جوں فلم تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی۔ انیل آہستہ روی سے شیتل کو اپنی محبت کے سحر میں جکڑتا چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے شرارتی تحفوں، چلبلاتے جملوں اور محبت کرنے والوں کے لطیفوں نے انیل کی بڑی مدد کی تھی۔ انیل اب پوری طرح مطمئن تھا کیونکہ اُس نے شیتل کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ جب کبھی انیل تنہا کسی سین کی ریہرسل کرتا تو وہ بیٹھ کر یک ٹک اُسے دیکھتی اور ایسے میں وہ پلکیں جھپکاتا بھی بھول جاتی۔

ایک سہ پہر، آر کے پی نے معمول سے پہلے ہی پیک اپ کا اعلان کر دیا۔ اب وہ اگلی صبح تک کے لیے فارغ تھے۔

”انیل؟“ روانگی سے ذرا پہلے شیتل کی آواز اُسے اپنے پہلو میں محسوس ہوئی۔ ”کیا تم ذرا دیر میرے ہاں رُکنا پسند کرو گے؟“

اور انیل نے اُس اندھے کی طرح فوراً اثبات میں سر ہلا دیا جس سے پوچھا گیا ہو کہ تمہیں دو آنکھیں چاہئیں؟

نصف گھنٹے بعد وہ شیتل کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

”کیا پوچھو گے؟“ شیتل نے دریافت کیا۔

”شراب محبت۔“ انیل نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”اور وہ بھی جام سے نہیں آنکھوں سے۔“

شیتل نے مُسکرا کر اسے دیکھا اور دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ اُٹھ کر خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شیتل نے استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”اپنی دُنیا کو دوسری دُنیا سے مقفل کر رہا ہوں۔“ انیل نے جواب دیا اور مُسکرا دیا،

شیتل نے بھی اس کی مُسکراہٹ کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

پندرہ سال بعد انیل کمار کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ تھا کہ اُس کی زندگی میں شیتل جیسی لڑکی پہلے اور نہ اُس کے بعد آئی۔ اُسے اُن لڑکیوں کی تعداد یاد نہیں تھی جن سے اُس کی دوستی رہی تھی۔ اداکارائیں، رقاصائیں، سیکرٹریز، ریسپشن گرلز اُس کی مداح لڑکیاں، اُس کے دوستوں کی بیٹیاں اور اُس کی بیٹیوں کی سہیلیاں، لیکن کوئی بھی شیتل کے پاسنگ نہ تھی۔

گوشیتل کے ساتھ اُس کے تعلقات کا اختتام کچھ خوشگوار انداز میں نہیں ہوا تھا لیکن وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ضرور تھا۔ اُس نے شیتل کے ساتھ اپنی زندگی کے پر لطف ترین اور ناقابلِ فراموش دن گزارے تھے۔ پہلی ملاقات کے بعد وہ انیل کے لیے یوں بے قرار رہتی جیسے کوئی بچہ اپنی پسندیدہ ٹافیوں کے لیے رہتا ہے۔ وہ انیل کے مطالبات کو کبھی نظر انداز نہ کرتی اور کوشش کرتی تھی کہ وہ اُس سے زیادہ سے زیادہ خوش اور مطمئن رہے۔

وہ تقریباً روزانہ اُس سے ملنے آتا۔ کبھی کبھار شیتل اُسے فرانس کی مثال دے کر چڑایا کرتی جہاں امیر لوگ اپنی بیوی کے پاس گھر جانے سے پہلے کچھ دیر اپنی زر خرید کے ساتھ گزارتے تھے۔ انیل اس پر گھول جاتا تھا۔

”تم غلطی پر ہو، ڈارلنگ۔“ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ ”یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھا کرو کہ تم میری مجبور ہو، زر خرید نہیں۔“

”مجھے تم پر اعتماد ہے، اُو۔“ شیتل پیار سے اُس کا سر سہلاتی۔ ”میں تم سے پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی۔“

”میری چینی گڑیا۔“ انیل اتنا ہی کہہ پاتا اور شیتل ایک پُر جوش مہر محبت ثبت کر کے اُسے خاموش کر دیتی۔

تین ماہ پُر لگا کر اُن گئے ”سائے“ مسلسل شوٹنگ کے بعد مکمل ہو گئی۔ فلم کے ماہرین کے خیال میں یہ یقیناً ایک کامیاب فلم ثابت ہوتی کیونکہ اس کے ریلیز ہونے سے پہلے ہی



شیتل اور انیل کی محبت کی داستان لوگوں کی زبان تک پہنچ چکی ہوتی۔

اور پھر ہوا بھی یہی، سائے ویسے بھی برصغیر پاک و ہند کے نہایت رومانوی کردار پر بنائی گئی تھی اور شیتل کی اداکاری نے اُسے چار چاند لگا دیے تھے۔ اُس نے کچھ اس طرح ڈوب کر اداکاری کی کہ فلمی ناقدین اور ناظرین بر ملا یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر ہیر واقعی ایک زندہ کردار ہے تو یقیناً وہ شیتل جیسی ہی ہوگی۔

اخبارات و رسائل میں یہ بھی لکھا گیا کہ شیتل نے ہیر کے روپ میں جو اداکاری کی ہے وہ کوئی اور اداکارہ کر ہی نہ سکتی تھی۔ دیوی تو اُسے پہلے ہی کہا جاتا تھا۔ ”سائے“ کی نمائش کے بعد اُس کے خطابات میں ایک اور اضافہ ہو گیا اور اُس کے چاہنے والے اُسے ”ہیر“ کے نام سے بھی مخاطب کرنے لگے۔

شیتل بنیادی طور پر لائابلی، سر اور لاپرواہی لڑکی تھی۔ بسا اوقات اُس پر سنجیدگی اور بڑے سن کا دورہ پڑتا۔ یہ لمحے انیل کے لیے بڑے مشکل ہوا کرتے تھے۔ ایک دن وہ شیتل کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر پھیلا ہوا تھا کہ وہ خلاف توقع ایک جینز اور ریشمی شرٹ پہنے اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی۔ اُس کا چہرہ دیکھتے ہی انیل سمجھ گیا کہ آج اُسے پھر یہ انا دورہ پڑا ہے۔

”میں آج ورغلانے والی کا کردار ادا نہیں کرنا چاہتی۔“ انیل کی توقع کے عین مطابق اُس نے اعلان کیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ میں ایک بڑا امن شادی شدہ زندگی گزارنے کی طرف راغب ہوتی جا رہی ہوں۔۔۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ تم نے مجھے اخلاقی تحفظ دیا ہے۔۔۔ یہ تمہاری ستائش نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ میں جتنا تمہیں چاہتی ہوں اُسی قدر تم پر اعتماد بھی کرتی ہوں۔ میں نے یہ الفاظ تم سے پہلے کسی مرد سے نہیں کہے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟ مرد اور عورت ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ یہ ضرورتیں تو آتی جانی ہیں لیکن اعتماد ہر شے کی بنیاد ہوتا ہے۔ جب میرے والدین سو گباتی ہوئے تو سب نے ہی مجھے نظر انداز کیا، میرے اعتماد کو بھیس پہنچائی اُس دن کے بعد سے میں کسی پر بھی اعتماد کرنے سے گھبراتی ہوں۔ کیونکہ جب تم کسی پر اعتماد کرتے ہو تو دن کہہ اُسے خود کو نقصان پہنچانے کا حق بھی دے دیتے ہو اور میں اپنی آئندہ زندگی میں خود کو مزید دکھ یا نقصان پہنچنے نہیں دینا چاہتی۔“

شیتل اس کے برابر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں چاہتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کی ملکیت ہو جائیں۔“ اس کا حرف مدعا زبان پر آ گیا۔ ”لوگ ہمیں ایک دوسرے کے نام سے پہچانیں۔“

”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں جان۔“ شیتل کو انیل نے خود سے قریب کرتے

ہوئے جواب دیا۔ ”میں ہمیشہ تمہارا ہوں۔“

حسب معمول وہ اپنی چکنی چیزیں باتوں سے موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔  
شونگ کے وقفوں کے دوران وہ شیتل کے ڈریسنگ روم میں ملتے۔ کسی کو انہیں  
ڈسٹرب کرنے کی ہمت نہ تھی بس ایک بار ایسا ہوا تھا کہ سلمیٰ نامی لڑکی منہ اٹھائے اندر داخل  
ہو گئی تھی۔ لحظہ بھر کے لیے وہ بید روم کی دیوار بنی رہی اور پھر انیل نے اُسے ڈانٹ کر باہر بھیج  
دیا۔

بعد میں انیل نے شیتل کو بتایا کہ اُس کی پشت پر کیا ہوا تھا ساتھ ہی اُس نے لڑکی کو گواہی  
مردادینے کا عندیہ بھی ظاہر کیا۔  
”نہیں۔“ شیتل جلدی سے بول اٹھی۔ ”معا ملے کو مجھے اپنے طور پر ہینڈل کرنے  
دو۔“

شیتل نے اُسے یہ بھی کبھی نہ بتایا کہ سلمیٰ کے ساتھ اُس کی کیا بات ہوئی ہے اور یہ کہ  
اُسے خود بھی کمرے میں سلمیٰ کی موجودگی کا علم تھا، لیکن انیل نے یہ ضرور دیکھا کہ رفتہ رفتہ  
دونوں کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔

وہ لڑکی آکاش اسٹوڈیوز کی موجودہ سربراہ سلمیٰ فاروق تھی۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہیں  
کیا تھا کہ ایک موٹی، بھدی اور بد صورت لڑکی بھارتی فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے  
اسٹوڈیوز کی سربراہ بن جائے گی۔

انیل نے سرگھما کر دیکھا۔ وال کلاک صبح کے چار بج رہا تھا لیکن نیند اُس کی آنکھوں  
سے کوسوں دُور تھی۔ اُسے اب شیتل کے ساتھ گزارے ہوئے آخری دن یاد آ رہے تھے۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟“ شیتل نے اس سے پوچھا تھا۔ ریتان  
دنوں اپنے بچوں کے ساتھ ماں باپ سے ملنے چندی گڑھ گئی ہوئی تھی اور وہ اس وقت شیتل  
کے گھر پر ہی موجود تھا۔

”میں تو تمہاری پرستش کرتا ہوں، ہنی۔“

”کیا یہ خوبصورت نہیں لگتا۔۔۔ میرا اور تمہارا اس گھر میں تمہارا جہنا۔“

”بالکل تمہاری طرح خوبصورت۔“ اُس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“

”کس بارے میں جان؟“

”دونوں کے اکٹھے رہنے کے بارے میں۔“ شیتل نے جواب دیا۔

”ہم ہمیشہ سے اکٹھے ہیں، جان۔“ انیل نے خالص سیاسی جواب دیا۔ ”ایسی الٹی

سیدھی باتیں کر کے اس شام کے کُسن کو کیوں تباہ کر رہی ہو؟“

”لیکن۔۔۔“

”میں اگلے ماہ فرانس روانہ ہو رہا ہوں۔ تین ماہ کی چھٹیاں گزارنے۔“

”کیا میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں؟“ شیتل نے پوچھا۔ ”سائے، مکمل ہو گئی ہے

اور اسٹوڈیو والے مجھے بھی چھٹی دینے کو تیار ہو گئے ہیں۔“

”میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں، شیتل؟“

”کس سلسلے میں؟“ شیتل سرپائے سوال تھی۔

”میں نے ایک سال پہلے ریتا اور بچوں کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”اور پھر، اُٹو۔“

”پھر کیا؟ میں واپس آ جاؤں گا۔ سب کچھ اسی طرح چلے گا جیسے اب چل رہا ہے۔“

”لیکن میں اس انداز کو پسند نہیں کرتی۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا شیتل۔“ انیل نے حسب معمول اُسے پکپکارا۔ ”چلو اب آؤ

میرے پاس میں تمہارے۔۔۔“

”جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، تم سمجھ نہیں رہے۔“ شیتل نے تیز آواز میں کہا۔ ”میں

شادی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ میں، تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی

ہوں کہ ہمارے اپنے بچے ہوں۔“

”اور ریتا کا کیا بنے گا، ہنی؟“ انیل نے پوچھا۔ ”ایک بیمار ماں کے ساتھ رہ کر بچوں

کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔“

”اوہ۔“ شیتل کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”گینٹ آؤٹ۔“

”سمجھنے کی کوشش کرو شیتل، اپنی محبت کی خاطر ایک گھر تباہ مت کرو، میں تمہیں کئی



آدی نارائن، آکاش اسٹوڈیوز کی سربراہی سے الگ ہو جانے کے باوجود بھی بمبئی کی فلمی دنیا کے ناڈاؤں میں شمار ہوتا تھا۔ اب بھی ذرا دیر پہلے وہ برطانیہ کے بعض فلم سازوں کے ہمراہ ایک کو پروڈکشن پر کامیاب مذاکرات سے فارغ ہوا تھا۔ جس کی شوٹنگ اگلے ماہ شروع ہونی تھی۔

اُس نے اسٹوڈیوز چھوڑ کر ایسی بہت سی کامیاہیاں حاصل کی تھیں۔ لیکن گزرے ہوئے واقعات اب بھی اس کے حلق میں پھانس کی طرح چبھتے تھے۔ آکاش اسٹوڈیوز کے مالکان، ایسٹرن بینکرز اور انٹرنیشنل اسٹاک ہولڈرز کے بعض آڈیٹرز نے اچانک اسٹوڈیوز کے فنڈز کا آڈٹ کیا اور یہ بات سامنے آئی کہ فلمی دنیا کا ایک باعزت اور قابل احترام شخص آدی نارائن اسٹوڈیوز کے فنڈز میں خرد برد کا مرتکب پایا گیا ہے۔ اُس کا ذمے دار کون تھا، یہ اُسے علم نہیں تھا۔ وہ تو یہ بات جانتا تھا کہ مالکان نے اُسے ایک ہفتے کے اندر اندر استعفیٰ دینے کو کہا تھا جبکہ دوسری صورت میں اُسے برطرف کر دیا جاتا۔

آدی نارائن نے باعزت راستہ اختیار کیا اور اُس نے اسٹوڈیوز کے واجبات ادا کرنے کی غرض سے نئی دہلی کی شاندار کوٹھی بیچ ڈالی جس میں ایک سوئمنگ پول اور ٹینس کورٹ بھی موجود تھا۔ وہ مالکان کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ انہوں نے اُسے جیل نہیں بھیجا، ورنہ وہ اتنے طاقت ور تھے کہ بااثر اور بارسوخ ہونے کے باوجود آدی کی باقی زندگی سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی۔

وہ گزشتہ چھ سال سے نیم سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ بعض اور عہدے داروں کو بھی برطرف کیا گیا، جن میں فنانس ڈائریکٹر جے جے سکینہ بھی شامل تھا۔ ساتھیوں کا غم اپنی جگہ، سب سے زیادہ دکھ اُسے اس بات کا تھا کہ وہ اصل مجرم کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کی بیوی پر کاٹا اپنے شوہر کی یہ رسوائی برداشت نہ کر سکی اور مختصری علالت کے بعد چل بسی۔

کوشش اُس کی یہی ہوتی تھی کہ وہ گزرے ہوئے تلخ دنوں کو یاد نہ کرے لیکن آج وہ اس کوشش میں ناکام ہو گیا تھا۔ برطانوی قلم سازوں سے کامیاب ملاقات کے بعد اُس کی سیکرٹری نے اُسے ڈاک کا ایک پلندہ دیا تھا اور اس پلندے میں سب سے اوپر جو لفظ رکھا تھا اُس نے اُس کے سارے زخم تازہ کر دیے تھے۔

ریال سے آنے والا لفظ شاہی دعوت نامہ تھا۔ تمام تر دکھ کے باوجود اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔ واقعی شاہی جوڑے کو اس خاص موقع پر اُسے نہیں بھولنا چاہیے تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید یہ شادی بھی نہ ہو سکتی تھی۔ دعوت نامے کے ساتھ شیتل کا ایک ذاتی خط بھی تھا جس میں اُسے۔ ”مستقبل کے بارے میں بات چیت کی غرض سے۔“ ایک ہفتہ قبل ریال پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا۔

آدی نارائن نے جان بوجھ کر شیتل اور رامیر کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور پھر شادی کے بندھن میں جکڑنے میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا جس کی تفصیلات سوائے پرکاشا کے اور کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں تھی۔

”سائے“ نے ریلیز ہو کر کامیابی کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے تو انیل کمار اپنی بیوی اور چار بچوں کے ہمراہ فرانس سدھار گیا اور اب شیتل کلکرنی اپنا خُسنِ مغموم لیے اُس کے دفتر پہنچی تھی۔

”میں شہر چھوڑ رہی ہوں۔“ اُس نے آتے ہی اعلان کیا۔  
 ”سُڈ۔“ اُس نے چہرے کو کافی لانے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“

”باہر۔“ شیتل کا جواب بڑا مختصر تھا۔

”تہا؟“

”ہاں۔“ شیتل نے سرگوشی کے سہ انداز میں کہا۔  
 ”شیتل؟“ آدی نارائن نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ عام حالات میں ہمیشہ اُسے دیوی کہہ کر پکارتا تھا۔ ”مجھے کوئی گڑبگڑ رہی ہے اگر تم ’سائے‘ کی طرف سے پریشان ہو تو فکر نہ کرو۔ وہ بہت اچھی فلم ہے باکس آفس کی رپورٹ بے حد شاندار ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سال کا شری پدم ایوارڈ بھی تم ہی جیتو گی۔“

”میں تھک گئی ہوں، آج شام میں شہر چھوڑ رہی ہوں۔“

”لیکن مجھے یہ تو بتا دو کہ تم کہاں جا رہی ہو؟“ آدی نے اصرار کیا۔ ”رابطے کا کوئی نمبر؟“

کوئی ذریعہ؟ نئے اسکرپٹ بھی تمہارے پاس ہیں، آخر میں تمہیں کہاں تلاش۔۔۔؟“

”فکر نہ کریں۔ مسٹر نارائن، میں چند ہفتوں میں واپس آ جاؤں گی۔“ شیتل نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں کچھ پریشان ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گی تو لوٹ آؤں گی۔“

وہ چلی گئی اور وہ اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لیے آنے والوں کی طرح محض ہاتھ ملاتا

رہ گیا۔



اُسے کچھ پتا نہیں تھا کہ شیتل کہاں ہے؟ اُسے اس کی ضرورت بھی نہ پڑتی اگر دہلی سے ڈاکٹر گوتم نیلامبر کا دھما کا خیر فون نہ آ جاتا۔۔۔ آدی نارائن کو تسلیم کرنا پڑا کہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن شیتل ٹھکرنی ان دنوں بسببی میں نہیں تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

”تو پھر اُسے ہر حال میں تلاش کرو۔“ ڈاکٹر کا حکمیہ لہجہ عود کر آیا۔ ”میں فوری طور پر اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

آدی نارائن کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ ڈاکٹر گوتم نیلامبر کوئی عام شخص نہ تھا جس کے حکم کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ وہ بھارتی وزیر اعظم کا مشیر اعلیٰ تھا۔ آدی جانتا تھا کہ اُسے ہر حال میں ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی ورنہ آئندہ کم از کم آکاش اسٹوڈیوز کی کوئی فلم برآمد ہو سکے گی اور نہ ہی کسی کو پروڈکشن کی منظوری ملے گی۔

لیکن وہ شیتل کو کہاں تلاش کرتا؟

رات اسی سوچ بچار میں گزر گئی۔ اگلے دن صبح اُس نے دفتر میں جو سب سے پہلا فون وصول کیا وہ ڈاکٹر گوتم کا ہی تھا۔ اُس نے ڈاکٹر کو مشورہ دیا کہ وہ چند دن انتظار کر لے۔

جواب میں ڈاکٹر پھٹ پڑا۔ ”میں اس وقت جس شخص کی نمائندگی کر رہا ہوں، وہ انتظار نہیں کر سکتا، جان رکھو کہ وہ اتنا ہی طاقت ور ہے جتنا کہ ہمارے صدر یا وزیر اعظم۔۔۔“

”مگر وہ ہے کون؟“ آدی نارائن نے دریافت کیا۔ ”میں شیتل کو تلاش کرنے میں دن رات ایک کر دوں گا لیکن مجھے بھی تو بتاؤ کہ میں اُسے کیا کہوں؟“

”اُسے بتانا کہ میں شہنشاہ محریت، رامیر زاہدی کی نمائندگی کر رہا ہوں اور ہر میجسٹری فوری طور پر مس شیتل ٹھکرنی سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”میرے پیارے ڈاکٹر گوتم۔“ آدی ہنس دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں، مس شیتل کی نمائندگی کر سکتا ہوں۔ وہ اس سے پہلے اتنے بادشاہوں، شہزادوں اور صدور سے ملی ہے کہ اب تمہارے بادشاہ سے قطعی متاثر نہ ہوگی۔“

”صرف ملنے کو کون کہہ رہا ہے۔“ ڈاکٹر گوتم کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا پیمانہ صبر اب لبریز ہوا چاہتا ہے۔ ”شہنشاہ نے مس شیتل ٹھکرنی سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔“

ریسپور آدی نارائن کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بچا۔ سونے کی چڑیا اُس کے ہاتھوں سے اڑی جا رہی تھی۔ آدی نارائن نے اُس کی خاطر بہت سی مختصص مول لی تھیں۔ خاص طور سے جن شرائط پر اُس نے شیتل سے معاہدہ کیا تھا وہ اتنی سخت اور گراں قدر تھیں کہ مالکان نے اُسے دہلی طلب کر لیا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا خطرہ، شیتل سے معاہدہ کر کے مول لیا تھا لیکن شکر تھا کہ وہ اس میں کامیاب قرار پایا تھا۔

اب اُس کا دوسرا امتحان سر پر تھا۔ ڈاکٹر گوتم نے اُسے کسی کمانڈنگ آفیسر کی طرح احکامات دیے تھے اور آدی نارائن کو ایک اچھے ماتحت کا کردار ادا کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ شہنشاہ بحریہ، دل کے معاملات بھی امور سلطنت کی طرح خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ شیتل کو فی الحال اُس کے منصوبوں کے بارے میں نہیں بتایا جانا تھا۔ ابھی اسے یہی کہا جاتا کہ شاہ پرستش کی حد تک اُس کا مداح ہے اور اُس نے کئی راتیں ریال میں اپنے شاہی محل اور بحیرہ کیپسین کے کنارے شاندار ولا میں اُس کی فلمیں کئی کئی مرتبہ دیکھ کر گزاری ہیں۔ پہلی بیوی کو طلاق اور دوسری کے انتقال کے بعد شاہ نے ایک پلے بوائے کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی تھی لیکن شیتل کو یہی بتایا جانا تھا کہ وہ پہلی لڑکی تھی جس سے شاہ متاثر ہوا ہے۔

یہ آدی نارائن کی ذمہ داری تھی کہ وہ دس دن بعد پیرس میں اُن لوگوں کو شیتل سے ملواتا۔ کم از کم ڈاکٹر گوتم نے یہی کہا تھا۔ ایونیو مونٹے گن پر واقع ہوٹل پلازہ ایتھنز میں اُس کی رہائش کے انتظامات کر لیے گئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو کسی دوست یا ملازمہ کو اپنے ساتھ لاسکتی تھی۔ صرف یہی نہیں آدی نارائن کو شیتل سے شاہ کے لیے رضا مندی بھی حاصل کرنی تھی۔ ناکامی کے امکانات صفر تھے۔ وہ شیتل اور ڈاکٹر گوتم کی ملاقات کروانا اور پھر الگ ہٹ جانا۔ ”رومانی مذاکرات“ خود ڈاکٹر گوتم کو کرنے تھے۔

پروگرام تو سارے طے پا گئے تھے لیکن آدی نارائن کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر شیتل کو کہاں سے پیدا کرے؟ سوچ سوچ کر اُس نے اپنی بیوی کو فون کر کے صورت حال بتائی۔ ”وہ آخر ہے کہاں؟“ پر کا شا بھی فکر مند ہو گئی۔

”کچھ پتا نہیں۔“ آدی نے زچ ہو کر کہا۔ ”بھارت اتنا بڑا ملک ہے، میں اُسے کہاں ڈھونڈوں، اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت ملک میں ہی نہ ہو۔“

دہلی کے نواحی علاقے کی شاندار ترین کوٹھی کے موجودہ مالکان کا نام گیتا نیلامبر اور ڈاکٹر گوتم نیلامبر تھا۔ مغلیہ طرز تعمیر کی شاہکار اس عمارت کی اصل مالک گیتا کی والدہ تھیں لیکن شومئی قسمت کہ گیتا اپنے امیر کبیر والدین کی واحد اولاد تھی اس لیے قدرتی طور پر تمام جائیداد کی حق دار وہی ٹھہری تھی۔

گیتا کا تعلق ایک سکھ خاندان سے تھا۔ اُس کے والد راج گوپال اپنے علاقے کے بڑے طاقتور زمین دار تھے۔ گیتا کی والدہ زرنجن کور اُس گاؤں میں اسکول ٹیچر کی حیثیت سے آئیں اور گاؤں کے چودھری کو بھاگئیں چنانچہ جلد ہی وہ زرنجن کور سے زرنجن گوپال بن گئیں۔ سالہا سال کی رفاقت نے انہیں ایک پھول سی بچی کا تحفہ دیا تھا جس کا نام گیتا راج رکھا گیا۔ گیتا کا نوٹ کی تعلیم یافتہ تھی اور نصف سے زیادہ تعلیم سوئٹزر لینڈ اور لندن کے اسکولوں میں حاصل کر کے آئی تھی۔ اسی لیے کچھ آزاد خیال بھی تھی۔ ڈاکٹر گوتم کو اُس نے ایک سرکاری تقریب میں وزیراعظم کے پہلو بہ پہلو دیکھا تو اُسی پر سمجھ گئی جس کا انجام شادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

شروع میں راج گوپال اور زرنجن گوپال کے دلوں میں کچھ کجی تھی لیکن پھر وہ بھی دُور ہو گئی اور انہوں نے دلش کے ایک طاقتور شخص کو اپنے داماد کے طور پر قبول کر لیا۔ کچھ عرصے بعد راج گوپال چل بسے تو زرنجن گوپال اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ منتقل ہو گئیں۔ اور انہوں نے اپنی زندگی میں ہی ساری جائیداد دونوں کے نام منتقل کر دی۔ اب وہ تینوں اسی عالی شان محل میں قیام پذیر تھے۔

زرنجن گوپال اُس وقت اپنے بیڈروم میں ہی تھیں جب تقریباً بھاگتی ہوئی گیتا اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سا لفافہ تھا۔

”امی!“ اُس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان پکارا۔ جانے وہ کہاں سے چلی آ

رہی تھی۔ ”شاہ بحریت اور اُس کی بھارتی ملکہ کا دعوت نامہ آیا ہے۔ گوتم بہت دن سے اس بارے میں بتا رہا تھا۔“

نرنجن گوپال نے صرف مُسکرا کر اکتفا کیا تھا۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہونے کے باوجود گیتا بھی بچی کی بچی ہی تھی۔

ایک زمانہ تھا کہ ہزاروں لوگوں کی قسمت گوتم کے قدموں کے ساتھ ڈوبتی اُبھرتی تھی۔ اُسے حکومت میں ایک ستون کی حیثیت دی جاتی تھی جو وزیر اعظم کے ہر اچھے بُرے فیصلے میں شریک ہوتا تھا۔ ملازمت کو خیر باد کہنے کے بعد اُس کی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی پُر اسرار ہو گئی تھیں۔ اُس کی مشاورت اب دُور دُور کے ملکوں میں جا پہنچی تھی۔ صبح وہ ایک دارالحکومت میں ہوتا تو شام دوسرے دارالحکومت میں گزرتی تھی۔

”اس وقت گوتم کہاں ہے؟“ نرنجن گوپال نے بدستور مُسکراتے ہوئے دریافت کیا۔  
 ”نصف گھنٹہ پیشتر وہ اسٹاک ہوم سے فلابی کر پڑکا ہے۔“ گیتا نے جواب دیا۔ ”کل اُس نے دہلی یونیورسٹی کے گریجویٹ سیمینار سے خطاب کرنا ہے، اُسے بین الاقوامی تعلقات اور طاقت کی موجودہ دوز کے بارے میں اپنا مقالہ پیش کرنا ہے۔“ گیتا کی آنکھوں کے چراغ جل اٹھے۔ ”لیکن آج رات وہ یہیں رُکے گا۔“

”میں نے بھی آج سہ پہر ایک سیمینار میں جانا ہے۔“ نرنجن گوپال نے اپنی بیٹی کو بتایا۔  
 ”امی، مجھے بالکل یقین نہیں آتا کہ آپ اس عمر میں بھی اُستانی ہیں۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اب اس کا کیا فائدہ؟“

”ابھی تم سمجھ نہیں پاؤ گی بیٹی۔“ نرنجن گوپال نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”جب تم دونوں کے بچے ہو جائیں گے اُس وقت معلوم ہوگا تربیت کس کو کہتے ہیں؟ فی الحال جاؤ، گوتم کے استقبال کی تیاری کرو، وہ بہت دن بعد گھر لوٹ رہا ہے۔“

رات کو اپنی خواب گاہ میں گوتم اور گیتا کی بات چیت کا واحد موضوع شیتل کا دعوت نامہ تھا۔  
 ”اگر تم اجازت دو گے تو میں ضرور جاؤں گی۔“ گیتا نے خالصتا بچوں کی طرح کہا۔

”کیوں نہیں؟“ گوتم نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”تم انہیں اور اُن کے شہر کو پسند کرو گی، بھلا دہلی کا ریا ل سے کیا مقابلہ؟“

”شاہ کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن شیتل سے تو مجھے نفرت ہے۔“ گیتا نے ناک  
 سکوڑی۔ ”شاہ کم از کم خاندانی آدمی تو ہے ملکہ تو گلیوں سے اُٹھ کر محل تک پہنچی ہے۔“  
 ”مت بھولو کہ اُس کا خاندان بھی بہت اعلیٰ تھا۔ اور پھر وہ اپنے وقت کی نامور اداکارہ

تھی جس کی چال پر زمانہ چلتا تھا۔“  
 ”اچھا خاندان؟“ گیتا نے اُس کے الفاظ دُہرائے۔ ”بہی کا سوہن ٹککرنی؟ اُس کا  
 خود ساختہ باپ؟ جو پہلے ایک مزدور تھا۔“

”میرا باپ بھی تو ایک معمولی دکاندار تھا۔“ ڈاکٹر گوتم نے اپنی بیوی کو یاد دلایا۔  
 ”آئی ایم سوری، گوتم! تم مختلف ہو، تم تصنع پسند تو نہیں۔ وہ تو شروع سے خود کو ملکہ سمجھتی  
 رہی ہے۔“

”وہ ہے، میری جان۔“ ڈاکٹر گوتم نے بیوی کے بال سہلائے۔ ”ذرا دعوت نامہ دیکھو،  
 اُس کا خط پڑھو۔“

”گیتا نے دو انگلیوں کے بیچ خط یوں پکڑا جیسے اُسے زہر میں ڈبو کر نکالا گیا ہو۔  
 ”ڈیر گیتا، گوتم!“

اس دعوت نامے پر یقیناً تم لوگوں کو کوئی حیرت نہ ہوگی۔ تم دونوں ہی  
 جانتے ہو کہ ہماری نجی زندگی بالکل الگ تھلگ رہی ہے اور ہم چاہتے  
 ہیں کہ اس نجی محفل میں تم دونوں ہمارا ساتھ دو۔ مجھے اور رامیر کو  
 احساس ہے کہ تمہاری زندگی کتنی مصروف ہے لیکن ساتھ ہی یہ اُمید بھی  
 ہے کہ تم کم از کم ایک ہفتہ ہمارے پاس ضرور گزارو گے میں نے بہی  
 سے اپنے کچھ سابقہ دوستوں، سری نگر کے ایک پادری، آنٹی وانکل  
 اور تم دونوں کو اس کی خصوصی دعوت دی ہے کیونکہ ان تمام کو میں اپنے  
 خاندان کا فرد سمجھتی ہوں۔ آنا ضرور، ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔ محبتوں  
 کے ساتھ۔

شیتل (اور رامیر)

وسیع و عریض ڈبل بیڈ کے ایک کونے پر آڑی ترچھی پڑی گیتا باقاعدہ خراٹے نشر کر رہی تھی اور دوسرے کونے پر لینا ڈاکٹر گوتم نیلامبر چھت کو آسمان سمجھ کرتا رہے گنتے میں مصروف تھا۔ یا شاید اپنے گزرے ہوئے ماضی کو کسی فلم کی طرح ذہن کے پردوں پر چلا رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ایک معمولی دکاندار کا بیٹا اتنا بڑا آدمی کیسے بن گیا؟ لیکن اس میں اُس کی کسی محنت کا دخل نہ تھا، وہ اپنے مقدر کو اس کا ذمے دار سمجھتا تھا۔ باپ نے صرف اتنا کیا تھا کہ خود اُن پڑھ اور غریب ہونے کے باوجود اُسے ایک ایسے اسکول میں داخل کرایا جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ بس یہ اسکول ہی گوتم کو اپنے پردوں پر بٹھا کر لے اُڑا۔ اس نے او لیول کا امتحان ریکارڈ نمبر لے کر پاس کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اتنے نمبر آج تک کسی نے نہ لیے تھے۔ گوتم کو وٹیفے کے طور پر بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کی پیش کش کی گئی۔ یوٹھا باپ، بیٹے کو جُدا کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن گوتم نے یہ جھک، ٹافیاں اور آٹا دال بیچنے کے لیے نہیں ماری تھی۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح باپ کو شیشے میں اُتار اور برطانیہ پہنچ گیا۔

یوں شاید وہ ہارورڈ کی تاریخ کا پہلا طالب علم تھا جس کا باپ بھارت کا ایک معمولی اور کم حیثیت دکاندار تھا۔

ہارورڈ کی دنیا ہی اور تھی۔ بھارت میں گوتم کی انتہائی خواہش کسی مشہور اداکارہ یا اداکار کی ایک جھلک دیکھ لینا تھی لیکن اُس چکا چوند ماحول میں جا کر اُس کی خواہشوں کی چار و وسیع ہوتی چلی گئی۔ معاملہ اداکاراؤں سے بڑھ کر ملکاوں اور شہزادیوں اور اداکاروں سے بڑھ کر شاہوں، صدور اور وزرائے اعظم تک جا پہنچا لیکن اب اُسے صرف انہیں دیکھنے کی خواہش نہ تھی بلکہ وہ ان کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ انہیں اپنا محتاج بنانا چاہتا تھا، لیکن کس طرح؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ابھی تک وہ تلاش نہ کر پایا تھا۔

ہارورڈ میں ہی اُس کی ملاقات بحریت کے شہزادے رامیر سے ہوئی۔ دونوں ہم جماعت تھے۔ گوتم ایک کٹر اور متعصب ہندو تھا لیکن پرنس رامیر پکا مسلمان۔ اس ایک بات کے علاوہ دونوں میں شاید کوئی خالص تفاوت نہ تھا۔ جلد ہی دونوں دوست بن گئے۔ اور لوگ ان کی مثالیں دینے لگے۔ جب شہزادہ رامیر کے والد کو جلا وطن کر کے اُسے شاہ بنایا گیا تو ڈاکٹر گوتم جشن تاج پوشی میں شریک ہونے والا شاہ کا واحد دوست تھا۔ یہی وہ دوستی تھی جس نے گوتم پر ترقی کے بے انتہا دروازے کھول دیے تھے۔

شیتل گلکرنی کے معاملے میں بھی سب کچھ گوتم نے ہی کیا تھا۔ اُس نے اپنی ذہانت سے مذہب اور رسم و رواج میں زمین آسمان کا فرق ہونے کے باوجود دونوں کو یک جا کر دیا تھا۔ اُسے یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ رامیر اور شیتل کی پہلی ملاقات سے لے کر شادی تک اُن کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔

امورِ سلطنت کی طرح بعض اور معاملات بھی ایسے تھے جنہیں دوسروں سے چھپانا گوتم اپنا فرض سمجھتا تھا رامیر اور شیتل کا معاملہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ گیتا گو اُس کی راز دار تھی اور اُس نے اُسے بہت کچھ بتا بھی دیا تھا لیکن شیتل اور رامیر کے بارے میں وہ بہت کچھ چھپا گیا تھا۔

شاہی شادی کا یہ شاخسانہ جسے ڈاکٹر گوتم ”بیسویں صدی کے معجزہ محبت“ کا نام دیتا تھا، جینیوا میں واقع شاہ رامیر کے محل سے شروع ہوا جہاں گوتم ایک اہم کاروباری بات چیت کے بعد شاہ سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ ظاہری طور پر وہ وزیراعظم بھارت کا مشیر تھا لیکن اُس پر یہ پابندی نہ تھی کہ وہ کسی اور ملک کی نمائندگی نہ کر سکتا۔ رامیر کی بات تو ویسے بھی الگ تھی کیونکہ تمام دنیا انہیں اچھے اور قریبی دوستوں کی حیثیت سے جانتی تھی۔

گذشتہ پورا ہفتہ بڑا مصروف گزارا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے سلطنت بحریت کے خصوصی ایجنسی کی حیثیت سے اپنے ہی ملک کے وزیراعظم سے ایک باضابطہ اور رسمی ملاقات کی تھی جس کے بعد وہ جنرل اسمبلی کے اجلاس سے بھارتی مندوب کی حیثیت سے خطاب کرنے لیے نیویارک گیا۔ پھر وہ روم جا پہنچا جہاں پوپ پال نے بھارتی عیسائیوں کے بعض معاملات پر بات چیت کے لیے اُسے طلب کیا تھا۔ وہیں اُسے پیغام ملا تھا کہ شاہ رامیر، جینیوا

میں اُس کا منتظر ہے۔

”تم جانتے ہو کہ میرا اسٹاف تم پر کڑی نظر رکھتا ہے اور اُس نے تمہارے بارے میں باقاعدہ ایک فائل مرتب کر رکھی ہے۔“ شاہ رامیر نے ہنستے ہوئے اپنے حیران و پریشان دوست کا خیر مقدم کیا تھا۔

”مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔“ گوتم حیرت کے سمندر سے نکل آیا تھا۔

”کیسے ہو؟“ شاہ رامیر نے ایک دوست کی حیثیت سے اسے بے جا القاب و آداب کے جھنجھٹ سے آزاد کر رکھا تھا۔

”تم سناؤ، میلان میں اطالوی مجبورہ کے ساتھ کیسی گزری؟“ رامیر نے دریافت کیا۔ گوتم بری طرح جھینپ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خوبصورت اطالوی اداکارہ اسٹیلا کے ساتھ اُس کی ملاقات کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

”میں بے وقوف تھوڑی ہوں کہ مجھے کوئی موقع ملے اور میں پہلو تہی کر جاؤں۔“ گوتم نے کھسکا کر جواب دیا۔

”اسٹیلا کی زلفوں میں کہیں تم میرا اہم ترین مشن تو نہیں کھو آئے۔“ رامیر نے پوچھا۔

”ہتھیاروں کی مجوزہ خریداری؟“

”ہاں۔“ رامیر نے جواب دیا۔ ”صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ مجھے نئے جہاز، بندوقیں، ٹینک اور اُس اسلحے کے اسپتیر پارٹس درکار ہیں جو پہلے سے میرے پاس موجود ہے۔ مجھے مزید انسٹرکٹرز کی بھی ضرورت ہے جو میری فوجوں کو تربیت دے سکیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ میری پڑوسی ریاستیں مجھ پر دانت تیز کیے بیٹھی ہیں۔ اسلامی ملکوں کی حمایت کرنے پر زور دیا بہت عرصہ پہلے میری امداد سے ہاتھ کھینچ چکے ہیں۔ لیبیا سے تعلقات کیا استوار ہوئے، امریکیوں نے بھی نگاہیں پھیر لیں۔ فرانس اور برطانیہ ویسے ہی ان کے دست نگر ہیں۔ بد قسمتی سے ہم مسلمانوں کے دشمن بھی مسلمان ہیں اس لیے چین نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ دوا اسلامی ملکوں کے درمیان اسلحے کی دوڑ میں فریق نہیں بنے گا۔ اب میرے پاس لے دے کے صرف بھارت ہی رہ گیا ہے جس سے میں اسلحے کی درخواست



کر سکتا ہوں کیونکہ وہ ہر اُس ملک کو امداد دینے کے لیے تیار ہے جو کسی دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتا ہے اور جب دونوں لڑنے والے مسلمان ممالک ہوں تو بھارت کے لیے وہ عید کا مقام ہے۔“

اپنے ملک کی بُرائی سُن کر گوتم کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔

”بھارت تمہاری مدد ضرور کرے گا۔“ اُس نے اپنے دوست کو یقین دلایا۔ ”لیکن ایک بات ذہن میں رکھو، وہ تمہیں جو اسلحہ فراہم کرے گا وہ امریکہ اور روس سے ہی ہتھیار محفوظ کیا گیا ہوگا کیونکہ بھارت ابھی اس اسلحے پر نہیں پہنچا کہ کسی مُلک کو اپنا تیار کردہ اسلحہ برآمد کر سکے۔ وہ بخوشی تمہارے لیے ڈاکے کا کردار ادا کر سکتا ہے لیکن تمہیں اُسے اپنی ضرورتوں کا احساس دلانا ہوگا۔ تم ہر جگہ کامیاب ہو لیکن اپنی ضرورتوں کے پروپیگنڈے میں بری طرح ناکام ہو۔“

”بے وقوف، تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں ایک عظیم مُلک کا سربراہ، اپنے لیے کوئی پریس ایجنٹ حاصل کروں۔۔۔ کوئی فلمی طرز کا پریس ایجنٹ؟“

گوتم فوری طور پر کچھ نہیں بولا۔ اُس نے جیب سے کیوبن سگار نکال کر سٹلگایا۔

”فلمی دُنیا۔۔۔؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ”چلے گا۔“ بالآخر اُس نے بلند

آواز میں کہا۔ ”لیکن فلمی پریس ایجنٹ نہیں۔۔۔ فلمی بیوی۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو!“ رامیر کو ہنسنے کا ٹھکانہ دیا۔

”نہیں، یہ بڑا زبردست مشورہ ہے، ایک بھارتی لڑکی جو ازل سے قابلِ پرستش رہی

ہو۔ کوئی ایسی لڑکی کہ لوگ جس کے اشارے پر ناپتے ہوں۔ رائے عامہ اُس کی مٹھی میں بند

ہو، کوئی گلوکارہ، اداکارہ۔۔۔ ان میں سے کوئی ایک۔۔۔ آخر فلمی دنیا میں کوئی نہ کوئی لڑکی تو

ایسی ہوگی جسے لوگ چاہتے ہوں، پیار کرتے ہوں، اس کا احترام کرتے ہوں۔“ گوتم گُری

سے اٹھ کر رامیر کے قریب آ گیا۔ ”تم اُس سے شادی کر لو گے تو دنیا اُسے اور تم دنیا کو اُس کی

آنکھوں سے دیکھو گے۔“

”بکواس۔“

”میرے آئیڈیے کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک نہ کرو۔“ گوتم بلبلاتا اٹھا۔ ”ایسی سیاسی

شادیاں تو صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہیں، خود تم نے دو کی ہیں۔“

”لیکن ایک ہندو بیوی؟ میں کٹر مسلمان، میرے عوام کیا سوچیں گے۔“

”مذہب رُوحوں کے نل بوتے پر چلا کرتے ہیں رامیر۔“ گوتم نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ”جسم اور جنس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ عورت مسلمان ہو یا ہندو، اللہ نے یا بھگوان نے اُس کی بناوٹ اور حُسن میں ذرا سا بھی فرق پیدا نہیں کیا۔ تم اُس سے اپنے مفاد کی شادی رچاؤ گے۔ تمہیں اس سے کیا غرض کہ اُس کی روح ہندو ہے یا مسلمان۔ تم وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی نہ کرنا۔ جہاں تک محبت اور مفاد اجازت دے، وہاں تک کا سفر طے کر لینا اور جو نبی مذہب کی سرحد شروع ہو لوٹ آنا۔“

”لیکن میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“ رامیر نے اعلان کیا۔ ”میں ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے بلا بھیجا تھا کہ تم اپنی حکومت کو مجھے بھارتی اسلحہ فروخت کرنے پر رضامند کر سکو اور تم نے مجھے ایک ہندو ملکہ فروخت کرنی شروع کر دی۔“

”تمہیں دونوں چیزیں مل جائیں گی۔“

”کس طرح؟“

”دیکھو، ہندو لڑکی سے شادی کرنے کی صورت میں بھارتی حکومت اور عوام دونوں کے دلوں میں تمہارے لیے پسندیدگی اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ باقی کام اُس لڑکی پر چھوڑ دو جو تمہاری بیوی بنے گی۔ لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہیں ملکہ بھی ملے گی اور اسلحہ بھی۔۔۔“

اور پھر گوتم نے اپنے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ اُس کی تحقیقات کے تمام ڈانڈے ایک ہی ہستی پر جا کر ملے۔ اور اُس ہستی کا نام تھا۔۔۔ شیتل کلکرنی۔

اُسے اس کے لیے کیا کیا پاپڑ نہ بیٹنے پڑے یہ ایک علیحدہ کہانی تھی، جاں گداز اور جاں پر سوز لیکن بلا آخر ڈاکٹر گوتم نیلا سرجیت ہی گیا۔ شیتل کلکرنی نے ہتھیار ڈال دیے اور اب پندرہ سال سے وہ بحریہ کی ملکہ تھی۔

رامیر کو مطلوبہ اسلحہ بھی مل گیا تھا۔

کمرہ وال کلاک کے چمکتے ہوئے ڈائل کے سوا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ امیر قطر کی جانب سے تحفے میں دیا ہوا طلائی وال کلاک دن بھر میں چوبیس بار الارم بجا کر ملکہ کو بتاتا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے اور اس وقت اُس نے ملکہ کو آگاہ کیا تھا کہ صبح کے چھ بج گئے ہیں۔

ملکہ نے خمار میں ڈوبی آنکھوں سے کلاک کی طرف دیکھ کر وقت کی تصدیق کی، تو بہ شکن انگڑائی لی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں نے ایک دوسرے میں پیوست ہو کر کئی خوبصورت ساز بجائے اور ملکہ نے ہاتھ گرا کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

ریال کے پیراڈائز پیلس کے پُر تعیش بیڈروم میں وسیع و عریض بیڈ پر وہ تنہا تھی جب کہ شاہ اُس وقت ہزاروں میل دور لندن میں مصروف تھا۔

شادی کے پندرہ سالوں میں وہ کئی مرتبہ تنہا بیدار ہوئی تھی۔ اُس نے کئی تنہا اور سیاہ راتوں کے دکھ جھیلے تھے لیکن حرف شکایت کبھی زبان پر نہ آیا تھا کیونکہ اُس نے اور رامیر نے اپنے ذاتی اختلافات اور دُوریوں کو عوام اور بچوں سے پوشیدہ رکھنے کا معاہدہ کیا تھا۔

برسرِ عام وہ اب بھی ایک خوش و خرم جوڑے کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور کوئی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ محل کے نجی حصے میں جاتے ہی اُن کے راستے مختلف ہو جاتے ہوں گے۔

یہ دُوریاں پانچ سال قبل اُن کے تیسرے بچے، نریام نامی لڑکی کی پیدائش کے وقت سے شروع ہوئی تھیں۔ یہ وہ موقع تھا جب شینسل نے پہلی مرتبہ اپنے شوہر کی بے وفائیوں اور دوسری لڑکیوں سے دوستی کی کہانیاں سنی تھیں۔ شروع میں وہ انہیں صرف افسانے سمجھی تھیں چنانچہ اُس نے اپنی محبتوں اور وفاداریوں میں کوئی فرق نہیں آنے دیا لیکن جب سے سوئٹزرلینڈ میں عذرا کے ساتھ ایک مشکل آفریں لمحہ گزرا تو ملکہ کو یہ افسانے سچ تسلیم کرنے پڑے تھے۔

اردن کپور کے ساتھ خود اُس کا معاشرہ اُس وقت شروع ہوا تھا۔ جب نریام نرسری کی عمر تک پہنچی لیکن یہ ہمیشہ کی فلمی دنیا کی روایتوں کے عین مطابق کوئی انتقامی عمل نہ تھا بلکہ یہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوا تھا اور اب چار سال ہو گئے کہ اردن کپور، بحریہ کی ملکہ شیتل رامیر کا باقاعدہ محبوب تھا۔

ابھی بھی اردن کپور رذرا دیر پہلے ہی ملکہ کے پاس سے روانہ ہوا تھا لیکن کمرے کے دروازے پر دوبار ملکہ کے بچوں کے ٹیوٹر کی یہاں طویل موجودگی کی گواہی دے رہے تھے۔

یہ اُس وقت شروع ہوا جب ولی عہد شہزادہ کریم دس برس کا تھا۔ قطر کے دورے پر جاتے ہوئے رامیر اور شیتل، شہزادہ کریم اور دوسرے بچوں کو آیاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے تھے۔ امیر قطر کے مہمان کی حیثیت سے ان کی ملاقاتیں خلیج کے طاقت ور رہنماؤں سے ہوتیں جن میں اُس وقت، ایران کے بادشاہ شاہ محمد رضا پہلوی اور ملکہ فرح دیا بھی شامل تھے۔ ملکہ فرح کے ساتھ اُس کی گاڑھی چھٹی تھی۔ اور جب جب مرد حضرات اجلاسوں میں شریک ہوتے، ملکہ فرح اور ملکہ شیتل، امیر قطر کے انکڈیشنڈ سوئمنگ پول کے کنارے گریساں ڈالے بات چیت میں مصروف رہتیں۔ موڈ ہوتا تو کبھی کبھار پیرا کی بھی ہو جاتی۔ ورنہ عموماً دنیا جہان کے موضوعات پر ہلکی ہلکی گفتگو ہی رہتی۔

ایک روز اس ہلکی ہلکی بات چیت میں بچوں کی تربیت کا معاملہ بھی زیر بحث آ گیا۔ ”میں اور میرے شوہر چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو تہران کے بہترین اسکولوں میں بھجوائیں۔“ ملکہ فرح پہلوی نے ملکہ شیتل کو بتایا۔ ”لیکن یہ ناممکن ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ محل سے متصل اسکول ہاؤس قائم کریں جس میں ہمارے بچوں کے ساتھ دوسروں کے بچے پڑھیں۔“

”کن کے بچے؟“ ملکہ شیتل پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”بہت سے منتخب بچے۔“ ملکہ فرح نے جواب دیا۔ ”بڑے بڑے تاجروں، صنعت

کاروں، ماہرین تعمیرات، فوجی افسران اور سفارتی نمائندوں کے بچے۔“

ملکہ شیتل کو یہ تجویز اس قدر بھائی کہ اُس نے واپس ریال پہنچنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ بحریہ انرویز کے شاہی بونگ میں جب اُسے شاہ رامیر کے ساتھ تنہائی نصیب ہوئی تو اُس

نے فوراً ملکہ فرح کی تجویز اُس کے سامنے رکھ دی۔

پہلے تو شاہ نے کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن ملکہ کا اصرار جب حد سے بڑھا تو اسے ہاں کرتے ہی بنی۔ ملکہ کو اس کے لیے خاصے دلائل دینے پڑے تھے۔

”میں بھارتی ہوں، لیکن میں بحریہ سے محبت کرتی ہوں۔“ شیتل نے شاہ کو بتایا۔

”مگر اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ میرے بچے، میرے وطن کے بارے میں

بھی کچھ جانیں۔ میں اس بات پر اصرار کروں گی کہ اُن کی تعلیم کسی بھارتی کی زیر نگرانی ہو۔“

شاہ خاموشی سے ملکہ کی بات کی گہرائی تاپنے کی کوشش کرتا رہا۔ ”ٹھیک ہے میں گوتم

سے بات کروں گا۔“ بالآخر شاہ نے جواب دیا۔

”پھر گوتم؟“ ملکہ چلا اٹھی۔ ”وہ جہنم کا باسی اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے؟“

”کیا اُس سے بہتر کوئی شخص تمہاری نظر میں ہے؟ وہ بھارت کو تم سے یا مجھ سے زیادہ

جانتا ہے۔“ شاہ نے ملکہ کو سمجھایا۔ ”وہ ہمیں کوئی بہتر آدمی تلاش کر دے گا۔“

اور ڈاکٹر گوتم نیلا مبر نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے بہت سے امیدواروں میں سے ایک

امیدوار کو ریال بھجوا دیا، جس کا نام تھا اردن کپڑ۔

ریشمیں بستر پر آنکھیں موندے دراز ریشمی ملکہ نے کروٹ لی اور وہ دن یاد کرنے لگی جب سنہرے شیر والے کمرے میں پہلی بار اُس کی ملاقات ارون سے ہوئی تھی۔ ارون جونہی دروازے سے گزر کر شاہی جوڑے کی طرف بڑھا اُسی وقت ملکہ اُسے دل دے بیٹھی تھی۔ ذہن میں وہ بار بار ڈاکٹر گوتم نیلا مبر کی فراہم کردہ معلومات دُہرا رہی تھی جو اُس نے امیدوار کے بارے میں فراہم کی تھیں۔

نام، ارون کپور، پیدائش لکھنؤ۔ بچپن سے ہی انگریزی میں تعلیم حاصل کی۔ عمر چھتیس سال۔ باپ یوپی کا معروف سرجن۔ ارون کی تربیت ہی بطور ماہر تعلیم ہوئی تھی۔ دو سال اُس نے بھارتی آرمی ایجوکیشن کورس میں بطور کپٹن گزارے۔ دہلی اور کلکتہ میں کئی پرائیویٹ انگریزی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔

نچی زندگی! دس سال پہلے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ سابقہ بیوی جیہ نے طلاق کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا۔ شادی سے پہلے، بعد میں اور شادی شدہ ہونے کے دوران بے شمار معاشقے، اس وقت کوئی لڑکی زندگی میں نہ تھی۔ بیرون ملک ملازمت کا خواہاں۔ خاص طور پر بچوں کے تعلیمی شعبے میں۔ صرف ایک بات بے حد ضروری تھی، سال میں ایک بار امریکہ کا دورہ، جہاں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ٹھکیاں گزارتا تھا۔ باقی وقت وہ شاہی جوڑے اور بچوں کی خدمت کرتا۔

بچوں بچوں ارون نزدیک آتا گیا، ملکہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ اپنی نشست سے اُٹھے بغیر شاہ رامیر نے ارون سے اپنی بیوی کا تعارف کرایا اور میز کی دوسری جانب پڑی واحد کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ارون ہنکریا ادا کرتے ہوئے باادب بیٹھ گیا۔

انگلیاں چٹختے ہوئے رامیر نے انٹرویو شروع کیا۔

”دلکھنؤ میں پیدا ہوئے؟“

اردن نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر رامیر سوال کرتا گیا اور اردن جواب دیتا گیا۔ اس دوران شیتل بڑے غور سے اُس کی صورت اور اُس کے انداز و اطوار کا جائزہ لیتی رہی۔ جس طرح اردن نے رامیر کی باتوں کے سیدھے سادے جواب دیے، پہلے کسی نے یہ جرأت کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

”ٹھیک ہے مسٹر اردن، انٹرویو ختم ہوا۔“ بلاآخر رامیر کی آواز سنائی دی۔ ”بچوں کو آپ کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔ جتنی جلد ہو سکا، اسکول کا آغاز ہو جائے گا آپ باقاعدگی سے ملکہ کو رپورٹ دیا کریں گے۔“

اردن نے اُٹھ کر آداب کیا اور اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ ملکہ کی نگاہوں نے دروازے تک اردن کا ساتھ دیا تھا۔

”میں اس شخص پر اعتماد نہیں کر سکا۔“ رامیر نے دروازہ بند ہونے کے بعد شیتل کو

مخاطب کیا۔

”گوتم تو کرتا ہے۔“ ملکہ نے شرارت سے آنکھیں پچائیں اور رامیر اپنا سامنہ لے کر

رہ گیا۔

ارون بھی اُس کی زندگی میں یونہی داخل ہوا تھا جیسے رامیر اور انیل داخل ہوئے تھے لیکن اس بار وہ نسبتاً زیادہ محتاط تھی۔ اسکول میں کام کے وقت اُس نے ارون سے مناسب فاصلہ رکھا اور ایک ملکہ کا سا رویہ ظاہر کیا۔ وہ دوسری جانب سے پیش رفت چاہتی تھی لیکن مایوس کن صورت حال یہ تھی کہ ارون نے اپنے جذبات کا اظہار کبھی نہ کیا۔ البتہ پوچھنے پر وہ ملکہ کو رپال کی ”فارنزر کالونی“ میں مقیم غیر ملکی لڑکیوں سے اپنے عشق کی داستانیں چٹخارے لے لے کر سُنا تا۔ ملکہ کے ساتھ بچوں کی پڑھائی کا ٹائم ٹیبل بناتے ہوئے وہ ایک باوقار فاصلہ رکھتا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ملکہ کو اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے نرمی کے آثار پیدا ہوتے نظر آنے لگے۔ پھر وہ ملکہ پر توجہ دینے لگا اور یہی تو ملکہ چاہتی تھی۔

ایک صبح ملکہ اپنے ارادوں میں کامیاب بھی ہو گئی۔ دونوں اب صبح سویرے محل کے قریبی جنگل میں گھڑ سواری کے عادی ہو گئے تھے کیونکہ اسی وقت وہ بچوں کی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے تھے۔

”ارون۔“ واپس محل کے دروازے پر پہنچ کر شیشیل نے اُسے مخاطب کیا۔ ”ناشتے کے بعد مجھ سے میرے اپارٹمنٹ میں ملو میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں جسے تم یقیناً پسند کر دو گے۔“

اور جو تحفہ شیشیل نے اُسے پیش کیا وہ بھگوان کو بھی دیا جاتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔

”میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ ملکہ نے جوابی لیتے ہوئے ارون کو رکو بتایا۔  
 ”گستاخی معاف، ملکہ میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“ ارون نے بصد ادب

جواب دیا۔

”بولو؟“

”شاہ کے ساتھ آپ کی محبت کا آغاز کیسے ہوا؟“



”پھر کبھی۔“ اُس نے دوبارہ جمائی لی۔ ”اب میں سونا چاہتی ہوں۔“

”جو ملکہ کی خوشی۔“ ارون نے جواب دیا۔۔۔۔

لیکن ملکہ سونہ سکی۔ ارون نے اُس کے ماضی کے زخم تازہ کر دیے تھے۔ اُسے گزرے

ہوئے لمحے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے تھے۔۔۔۔

oo

انیل کمار کے ساتھ تعلقات ختم ہو جانے کے بعد وہ سلمیٰ سمیت کسی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی حالانکہ سلمیٰ اُس کی واحد اور بہترین دوست تھی۔ اُس نے اپنی لمبی مریڈیز نکالی۔ ضرورت کے چند جوڑے اور سامان ڈکی میں بھرا اور تن تہا شمال کی جانب چل دی۔ اُس نے شملہ جا کر سانس لی تھی۔

کئی دن تو سکون میں گزرے لیکن پھر ایک روز سلمیٰ کا فون آ گیا۔  
 ”کیسی ہو، شیتل؟“ سلمیٰ نے چپکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”گڑھوں میں گزی ہوئی۔“

”اب بھی اُسی اداکار کے بارے۔۔۔“  
 ”پلیز، سلمیٰ، اُس کا نام نہ لو۔۔۔ یہ بتاؤ کیسے فون کیا؟“  
 ”میرے پاس تمہارے لیے کچھ خبریں ہیں۔“  
 ”کیا تم پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہو گئی ہو؟“  
 ”خبریں تمہارے بارے میں ہیں۔“

”اور میں خود کشی کے لیے شملہ کی سب سے اونچی پہاڑی پر چھلانگ لگانے کھڑی ہوں۔“

”بے شک کر لینا لیکن ڈاکٹر گوتم نیلامبر سے ملنے کے بعد۔“  
 ”وہ ویسٹرن پلے بوائے؟“ شیتل نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”میں اس سے یا کسی اور سے نہیں ملنا چاہتی۔“

”گوتم کو اپنے لیے تم سے ڈیٹ نہیں چاہیے۔ وہ کسی بہت ہی اہم آدمی کا نمائندہ بن کر بات کرے گا۔“

”کیا وہ اب بھی وزیراعظم کا مشیر ہے؟“

”کیا خودکشی کرنے؟“ سلسلی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔  
لیکن بات چیت کے آخر میں سلسلی جیت گئی تھی۔ شیتل نے جمعرات کی شب نو بجے  
ڈاکٹر گوتم نیلا مبر سے ملنے کی حامی بھری تھی۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بدھ کی رات تک  
واپس سببی پہنچ جائے گی۔

جمعرات کو ٹھیک نو بجے گوتم نے تنہائی میں شیتل سے ملاقات کی۔ دو سیکرٹ ایجنٹ اس کے ہمراہ تھے جو دہلی سے اُس کے ساتھ آئے تھے لیکن گوتم نے انہیں باہر ہی ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور شیتل کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ سلمیٰ دوسرے کمرے میں ہی رک گئی تھی۔ وہاں، گوتم نے اسے بتایا کہ وہ بحریہ کے شاہ رامیر کی نمائندگی کر رہا ہے۔ شیتل، رامیر کے بارے میں جانتی تھی کیونکہ وہ ایسی عالمی شخصیت تھا جس کی تصاویر آئے دن ٹی وی اور اخبارات کی زینت بنتی رہتی تھیں۔

”میں شاہ رامیر کی معزز مہمان کی حیثیت سے آپ کو پیرس کے پندرہ روزہ دورے کی دعوت دیتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔“ گوتم نے محتاط انداز میں کہا۔ ”وہ اپنے نیولی کے محل میں مقیم ہیں۔ آپ کی رہائش کا انتظام ہوٹل میں ہے۔ شاہ آپ کی آمد کے اگلے روز ایک ڈنر کا اہتمام کر رہے ہیں۔ وہاں دوسرے مہمان بھی ہوں گے لیکن یہ علم نہیں کہ کون کون؟ آپ جس طرح چاہیں لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔“

گوتم بغیر فل اسٹاپ، کوئے کے گفتگو کر رہا تھا اور اس نے شیتل کے ردِ عمل کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

”میں چارلس ڈی گال ائر پورٹ پر آپ کا منتظر ہوں گا۔ ہوٹل پلازا ایتھنز میں آپ کے لیے وی آئی بی سوئٹ بک ہے۔ ایک کار معہ باوردی ڈرائیور آپ کی صوابدید پر ہوگی۔

آپ جب تک چاہیں، پیرس میں ٹھہر سکتی ہیں۔ اپنے لیے شام کے چند گاون اور کچھ عام پہننے کے کپڑے ساتھ لے جائیے گا باقی کسی شے کی ضرورت ہوگی تو ڈاکر کی جانب سے بھجوا دی جائے گی۔“

”میں اپنی ایک سیٹیلی کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔“ شیتل کو اپنی آواز اجنبی سی لگی کیونکہ اب تک اس نے دعوت قبول نہ کی تھی۔

”میرزا خیال ہے، آپ دوسرے کمرے میں موجود نو جوان لڑکی کے بارے میں بات کر رہی ہیں؟“

”سہیلی میری واحد اور عزیز ترین دوست ہے۔“ شیتل نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔  
 ”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ گوتم نے جواب دیا۔ اُس نے جھک کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور چلا گیا۔

دو ہفتے بعد شیتل، سہیلی کے ہمراہ پیرس میں اتری۔ ائرپورٹ پر اُن سے دی آئی پی مہمانوں کا سلوک ہوا اور اُن سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوئی۔ ڈاکٹر گوتم، چار لیوموزین کاروں کے ہمراہ اس کے استقبال کو آیا تھا۔

ہوٹل کے دی آئی پی سوئٹ میں انہیں دو طلائی پرس ملے جو شاہ رامیر نے ان کے لیے بھجوائے تھے۔ یہ دونوں کے لیے شاہ کا پہلا تحفہ تھا۔ جن پر ”خوش آمدید۔ رامیر“ کندہ تھا۔  
 ڈنر اگلی شب تھا۔ سہیلی اپنی زندگی میں پہلی بار بھارت سے باہر نکلی تھی اس لیے وہ شیتل کی اتنی احسان مند تھی کہ جب اُسے خبر ملی کہ وہ رامیر کے ڈنر میں نہیں جائے گی تو اس نے بالکل بُرا نہ منایا بلکہ اس نے ڈنر پر جانے کے لیے خود شیتل کو اپنے ہاتھوں تیار کیا تھا۔

باوردی ڈرائیور، شیتل کو رامیر کے محل لے گیا جو پیرس کے انتہائی فیشن ایبل علاقے میں درختوں کے پتھوں بیچ واقع تھا۔ اندرونی رہائش قابل دید تھی۔ چاروں طرف ہیروں کے فانوس، سنگ مرمر کے فرش، ایرانی قالین اور چینی کے ظروف بکھرے ہوئے تھے۔ محل کی زیبائش دیکھ کر شیتل کو بے اختیار فلم ”جہانگیر“ یاد آگئی جسے دنیا کی چند مہنگی ترین فلموں میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل تھا اُس کے سیٹ اور ملبوسات قیمتی ترین تھے۔ شیتل نے اس میں ملکہ نور جہاں کا کردار ادا کیا تھا۔

ایک بٹلر نے آگے بڑھ کر شیتل کا سفید منک کوٹ تھام لیا جب کہ دوسرا سے بالائی منزل پر لے گیا۔ انتہائی نفاست سے سجے ہوئے کمرے میں درجن بھر افراد جمع تھے۔ رامیر ایک چھوٹے سے گروپ سے الگ ہو کر شیتل کی طرف بڑھا۔

وہ خاصا حسین اور جاذب نظر تھا۔ عمر 35 سال قد اس کی توقع سے زیادہ تھا۔ اُس کا چہرہ جانا پہچانا دکھائی دیتا تھا کیونکہ شیتل اُسے بہت مرتبہ ٹی وی پر اور اخبارات میں دیکھ چکی تھی۔ لیکن اُس کا اصل حسن اب تک کوئی پیش نہ کر پایا تھا۔ سیاہ رنگ کی آنکھیں اور نرم جلد، جس میں ہلکی سی کافی گھلی گئی تھی، کھڑی ناک، ابھرے رخسار، بھرے بھرے گال، مضبوط بدن۔ شیتل نے نظر بھر کر اُس کا جائزہ لیا اور پھر خود ہی فیصلہ دے دیا۔۔۔ پر لیس والے غلط کہتے ہیں، رامیر بد صورت یا عفریت نما نہیں ہو سکتا لیکن پھر فوراً ہی دوسری سوچ نے غلبہ پا لیا۔ چند ہفتے پہلے ہی تو اس نے کبھی بھول کر بھی مردوں کا نام نہ لینے کا عہد کیا تھا۔

گوتم نے دونوں کا تعارف کرایا اور رامیر نے جھک کر اس کا دایاں ہاتھ تھاما، اُس کی مخروٹھی انگلیوں کو ہونٹوں کے لمس سے آشنا کیا اور آد پر اُس کا شکر یہ ادا کیا۔

گوتم دوسرے مہمانوں میں گم ہو گیا اور رامیر شیتل کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا۔ سب سے پہلے رامیر نے اُسے اپنی والدہ سے متعارف کرایا۔ وہ بارعب خاتون واقعی کسی ملک کی ملکہ لگتی تھیں۔ رامیر کی بڑی بہن عذرا بھی وہاں موجود تھی وہ حال ہی میں پلاسٹک سرجری کروا کر امریکہ سے لوٹی تھی۔ اور اس وقت اپنے نوجوان محبوب ایلڈو کے ساتھ تھی۔ اخبارات میں شیتل نے پڑھا تھا کہ عذرا کی شادی ایک افریقی شہزادے سے ہوئی تھی لیکن یہ بندھن جلد ہی طلاق پر منتج ہوا۔ عذرا کے بعد رامیر نے دوسرے مہمانوں سے اُس کا تعارف کرایا جو اُس کے اسٹاف ممبرز اور اُن کی بیویاں تھیں۔

کھانے کے دوران وہ رامیر کے دائیں اور اُس کی والدہ بائیں جانب بیٹھیں۔ میز پر موجود تمام لوگ شیتل کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ نیلام کی میز پر رکھی کوئی بے جان شے ہو۔ رامیر کھانے کے دوران وقفے وقفے سے اُس کے کان میں سرگوشیاں کرتا رہا۔ اس نے بہنئی میں گوتم کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کی کہ ہندی نہ سمجھنے کے باوجود اُس نے شیتل کی تمام فلمیں کئی کئی مرتبہ دیکھی ہیں۔ شیتل سر ہلانے کے سوا کوئی جواب نہ دے سکی تھی۔

ہوٹل پلازہ واپس آتے ہوئے گوتم نے شیتل کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”آپ میرے دوست کی آخری اُمید ہیں مس۔“

”آپ کے دوست کو مجھ سے کیا اُمیدیں ہیں دادا جان؟“ شیتل نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”براماننے کی ضرورت نہیں مس شیتل، رامیر دنیا کا مستند اور امیر ترین کنوارہ ہے، اور آپ نے اُسے خوش کر دیا ہے۔“

”میں بھی کوئی کوئلے بیچنے والی نہیں مسٹر گو۔۔۔ تم۔“ شیتل نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ بھول گئے ہیں تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ پوری دنیا میں نہ سہی لیکن کم از کم ایشیا میں، میں سب سے زیادہ چاہی جانے والی لڑکی ہوں۔“

”بے شک۔“ گوتم نے فوراً تائید کی۔ ”اس لیے تو کہتا ہوں کہ جوڑی خوب بچے گی۔“ ”ادھر دیکھو گنجے کیو پڈ۔“ شیتل اُس کا کوئی لحاظ کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ ”مجھے تمہارے یا تمہارے دوست کے لیے نہیں بھیجا گیا۔“

”ہزار بار معذرت مس شیتل۔“ گوتم کا لہجہ کچھ اور نرم ہو گیا۔ ”میں آپ کے اور اپنے دوست کے درمیان کسی باعزت رشتے کی بات کر رہا تھا۔ ہمیں لازمی طور پر اپنے آئندہ منصوبے ترتیب دینے ہوں گے۔“

”کیا دینے ہوں گے۔۔۔؟ تم میری تو بہن کر رہے ہو، بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا اسکول میٹ۔“

”وہ ایک ملک کا بادشاہ ہے۔ کسی کے بارے میں اس طرح بات نہیں کی جاتی۔“

”تو پھر میں اپنا نام جھام اٹھا کر گھر واپس جا رہی ہوں۔“

”آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔ میری بات سنیں مس شی۔۔۔“

”تم میری بات سنو۔“ شیتل نے اُسے ٹوک دیا۔ ”اگر ہم دونوں کے درمیان کوئی رشتہ استوار ہونے والا بھی ہے تو کیا تم ہمیں بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا کر رخصت ہو گے؟“

گوتم کو اب اپنی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ بھارت کی

نرم و نازک ٹاپ اشارا اس قدر منہ پھٹ بھی ہوگی۔

”ٹھیک ہے شاہ آپ کو کل صبح خود فون کر لیں گے۔“ گوتم کا لہجہ اور انداز بدلا ہوا تھا۔

”اپنے شاہ کو بتا دینا کہ میں دوپہر تک سوتی ہوں۔“

گوتم نے مزید بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن محض ہوا نکل کر رہ گیا۔ مزید بے عزتی کروانے کے بجائے اُس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہوٹل پہنچتے ہی سلمیٰ نے اُسے گھیر لیا۔ اُس نے سانس لیے بغیر اسی پر تباہ توڑ سوالات کیے تھے۔

”شاہ کو دلی عہد کی پیدائش کے لیے ملکہ کی ضرورت ہے۔“ شیتل نے ایک ہی جملے

میں اس کے تمام سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے، شادی؟“ سلمیٰ نے خوشی سے بے قابو ہو کر پوچھا لیکن فوراً ہی

اس کا سارا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ”اور اگر تم ولی عہد پیدا نہ کر سکیں تو تمہیں استعمال شدہ نیپکن کی طرح کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے گا؟ کیا تم اسے ولی عہد کی منی بیک گارنٹی دو گی؟“

شیتل کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”میں چار بار ماں بننے کی سعادت سے محروم ہو چکی ہوں۔“ شیتل نے انکشاف کیا۔

”لیکن اُس وقت میں اپنے کیرئیر کے عروج پر تھی اور ماں بننے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی مگر اب بات دوسری ہوگی۔ میرے تین بھائی ہیں۔ بھگوان نے ان تینوں کو بیٹوں سے نوازا ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ میں بھی بیٹوں کی ماں ضرور بنوں گی۔۔۔ لیکن ابھی تو شاہ نے مجھے شادی کی کوئی پیش کش نہیں کی۔“

اگلے روز دوپہر کو شاہ نے اُسے فون کیا۔ ایک گھنٹے بعد شیتل اُس کے محل کے سامنے موجود تھی۔ شاہ اپنی جیکوار میں تنہا اُس کا منتظر تھا۔ اس نے بتایا کہ گوتم اور خاندان کے دوسرے افراد واپس جا چکے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دونوں لاٹنگ ڈرائیو پر روانہ ہو گئے۔ شیتل کو یقین تھا کہ شاہ کے باڈی گارڈ اگر دُسرور موجود ہوں گے لیکن کوشش کے باوجود کسی شخص کو دیکھ نہیں پائی۔

دودن وہ پیرس کے گرد و نواح میں گھومتے رہے۔ تیسرے روز ڈنرا انہوں نے پیرس کے مشہور ترین لا ہوٹل میں کیا اور اس کے بعد شاہ معمول کے مطابق شیتل کو ہوٹل پلازہ چھوڑنے کے بجائے اپنے محل لے گیا۔ شیتل نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ اُسی شب رامیر نے اُسے شادی کی پیش کش کی جسے شیتل نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی قبول کر لیا۔

ناشتا انہوں نے شادی کی منصوبہ بندی کے دوران کیا۔

”ڈاکٹر گوتم انتظامات کرے گا۔“ رامیر نے بات شروع کی لیکن جب اُس نے شیتل کے چہرے پر تاقوت محسوس کیا تو کرسی اُس کے نزدیک کھینچ لی۔ ”مائی ڈارلنگ“ اس نے پیار سے شیتل کے گال تھپتھپائے۔ ”ہم چار دیواری میں دُنیا کے دوسرے جوڑوں سے مختلف نہیں ہیں لیکن عوام کے سامنے ہمارے چہرے مختلف ہیں، میرے ملک کے لوگوں کے لیے، جواب تمہارے بھی ہوں گے، شادی اسی طرح کرنا ہوگی جس کی وہ کسی حکمران سے توقع کر سکتے ہیں۔ ان چیزوں میں گوتم ماہر ہے۔ وہ میرا دوست ہے اور یقیناً تمہارا بھی اچھا دوست ثابت ہوگا۔ میری پیاری شیتل! میری مجبوری ہے کہ میں خاموشی سے شادی نہیں کر سکتا جب ایک اسلامی ملک کا سربراہ شادی کرتا ہے تو بہت سی رسومات ادا کرنی ہوتی ہیں۔ ابھی تو تمہیں مسلمان کیے جانے کا مرحلہ۔۔۔“

”میرے کس کا مرحلہ!“ شیتل نے چوک کر پوچھا۔

”میری دلہن کو بہر صورت مسلمان ہونا چاہیے۔ اپنے عوام سے یہ میرا وعدہ ہے۔“

”لیکن میں تو مسلمان نہیں۔ بلکہ ہندو ہوں۔“

”کوئی مسئلہ نہیں، ایک مولانا صاحب تمہاری تربیت کریں گے پھر تمہیں مسلمان کیے جانے کی ایک سادہ سی تقریب ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ بحریت کے گھلے دل و دماغ کے لوگ بھارت کی مسلمان دلہن کو بطور ملکہ قبول کر لیں گے۔“

”لیکن میرا نام؟“

”شیتل کلکرنی کے بجائے شیتل رامیر ہو جائے گا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے کہ شیتل کلکرنی بس یہی ہے؟“ اُس نے نظریں جھکا کر دریافت



کیا۔ ”کیا آپ مجھے صرف فلموں اور رسالوں کی حد تک جانتے ہیں؟ مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھیں گے؟“

”نہیں۔“ رامیر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میری شیتل! مجھے تمہارے بارے میں ایک ایک بات کی خبر ہے۔ تمہارے ٹیکسی ڈرائیور باپ، تمہاری والدہ کی خودکشی۔ تمہاری دہلی کی زندگی، بمبئی اسکول کی کارگزاریاں۔ حتیٰ کہ ماں نہ بن سکنے کے تمام واقعات میرے علم میں ہیں۔“

”سب کچھ!“ شیتل نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، انیل کمار کے ساتھ تمہاری محبت کا شاخسانہ بھی میرے علم میں ہے۔“ شاہ نے اس کے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں ان سب باتوں کے باوجود تمہاری پرستش کرتا ہوں، تم زمانے کے لیے کچھ بھی سہی، میرے لیے دیوی ہو۔“

”میں شادی سے پہلے فادر فلین سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”میں گوتم سے کہہ کر اچھٹام کروادوں گا۔“

”پھر گوتم۔۔۔؟“ شیتل نے ابرو چڑھائے تو رامیر نے کھینچ کر اُسے اپنے قریب کر

لیا۔

سلمی کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ شیتل اپنا مذہب تبدیل کر رہی ہے۔ اُس نے دبے الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اُسے، شیتل کے ملکہ بننے سے زیادہ اس کے مسلمان ہونے کی خبر پسند آئی ہے۔

پیرس سے دونوں بحریت ائرویز کے خصوصی شاہی طیارے سے دہلی پہنچیں اور اپنی آمد کے فوری بعد شیتل فادر فلین سے ملنے سری نگر روانہ ہو گئی۔ فادر فلین ایک کیتھولک پادری تھا اور خود شیتل کو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے کسی ہندو سادھو سے اجازت لینے کے بجائے ایک ایسے شخص کے پاس جا رہی ہے جو پہلے ہی اس کا ہم مذہب نہیں تھا، لیکن پھر اس نے اس خیال کو خود ہی مسترد کر دیا کیونکہ وہ فادر فلین سے ملنے مذہب کی ڈور میں بندھ کر نہیں بلکہ انسانیت کی ڈور میں بندھ کر جا رہی تھی۔

فادر فلین نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اسے ملکہ بننے کی پیشگی مبارک باد دی۔ لیکن

جب وہ مطمئن مطمئن سمی پہنچی تو آدی نارائن ایک نئی خبر کے ساتھ اُس کا منتظر تھا۔ بقول اس کے، اپنے معاہدے کے تحت شیتل، آکاش اسٹوڈیوز کے لیے مزید دو فلمیں مکمل کرانے کی پابند تھی۔ آکاش کے مالکان کے وکلاء کا اصرار تھا کہ وہ ہر حال میں فلمیں مکمل کروائے کیونکہ اس وقت شیتل سونے کی کان تھی۔ آدی نارائن نے اُن کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ سارے شاخسانے کی جڑ ڈاکٹر گوتم نیلامبر ہے اور اگر شیتل کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی ہوئی تو آکاش کی کسی فلم کو بھارت میں نمائش کا سرٹیفکیٹ تک نہ ملے گا چنانچہ وکلاء نے شیتل کو معاہدے کی پابندی سے آزاد کر دیا اور بین الاقوامی تعلقات کی خیر سگالی کے تحت اس آزادی کو اس کی شادی کا تحفہ قرار دیا۔

جو ہو میں اپنے بنگلے پر انیل کمار کا ایک خط بھی شیتل کے نام موجود تھا جو فرانس کے کسی مقام سے ارسال کیا گیا تھا۔ شیتل نے بند لفاظی سلمیٰ کے حوالے کر دیا اور اس نے اسے اسی طرح پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

شیتل کو سمی میں اپنے معاملات نمٹانے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ اس عرصے میں رامیر روزانہ درجنوں بار فون کرتا رہا۔ شادی کا معاملہ ہنوز خفیہ تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس کا اعلان ریال کے شاہی دربار اور سمی سے نارائن کے دفتر سے بیک وقت ہو۔

اور جب یہ خبر ریلیز ہوئی تو جیسے پورے بھارت میں زلزلہ آ گیا۔ شیتل کے لاکھوں مداحوں نے اپنے اپنے طور پر جشن منائے اور ہزاروں دھاڑیں مار مار کر رو دیے۔ اخباری نمائندے شہد کی مکھیوں کی طرح شیتل سے چٹ گئے۔ ہر جگہ اس کا تعاقب ہونے لگا۔ غیر ملکی صحافی بھی اس صف میں شامل ہو گئے کیونکہ یہ خبر دنیا بھر کے لیے یکساں اہم تھی۔ شیتل جب سمی سے رامیر کے خصوصی طیارے میں پیرس کے چارلس ڈی گال ایئر پورٹ پہنچی تو سینکڑوں کیمرے اس کے منتظر تھے۔ جب رامیر کے ساتھ کرسٹائن ڈائر کی سیلون پر گئی، جہاں رامیر نے اُس کے لیے ایک سو سے زائد ملبوسات خریدے تو بھی اخباری نمائندے اُس کے تعاقب میں تھے۔ اپنے عروسی جوڑے کی خریداری البتہ شیتل نے انتہائی رازدارانہ طریقے سے کی اور اخباری نمائندے تو گجرا رامیر بھی اُس کے ہمراہ نہ تھا۔

ریال میں پہلے اُس کی ابتدائی تربیت ہوئی۔ اُس کے مسلمان ہونے کی تقریب محل کی

مسجد میں انجام پائی۔

اگلے روز شادی کی تقریب ہوئی جو بحریت کے لوگوں کو صدیوں یاد رہتی۔ شاہی شادی میں سربراہان مملکت اور دنیا بھر سے آئے ہوئے معزز مہمانوں نے شرکت کی، نو بیاہتا جوڑے نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پھول سجا کر سینکڑوں تصویریں بنوائیں۔ رائٹر نے باقاعدہ ایک عالمی سروے کیا۔ صرف مارلین منرو، جیکی اوناسس اور ماؤ، شاہی جوڑے سے آگے تھے لیکن شیتل کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو رامیر کے ساتھ خوش و خرم شادی خدہ زندگی کی خواہاں تھی۔

ہنی مون انہوں نے کیسپین میں شاہی بجرے پر منایا اور جب شیتل ریال لوٹی تو وہ ماں بننے والی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اب اس کے راستوں میں، اُس کے مستقبل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

ملکہ نے آنکھیں بند کیے کیے ہاتھ بڑھا کر وہ بٹن دبایا جو ناریت کے لیے اشارہ تھا کہ اس کا ناشتا لے آئے۔ ہاتھ واپس چہرے پر آنے کے بجائے اس نیکیے پر پڑا جہاں کچھ دیر پہلے تک ارون کپڑا کا سر موجود تھا مگر اب وہاں اس کی خوشبو کے سوا کچھ نہ تھا۔

ناریت مسلے ہوئے نیکیے اور شکن آلود چادر کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ جاتی اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے ذومعنی مسکراہٹ سے ملکہ کو دیکھا اور ناشتا سائیڈ ٹیبل پر سجا دیا۔ ملکہ نے ناریت کی مسکراہٹ کا جواب اپنے ہونٹوں پر مسکان سجا کر دیا تھا۔

ناریت ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس نے شیتل سے پہلے آنے والی دونوں ملکائوں کی خدمت کی تھی۔ وہ عموماً بیڈروم کے باہر موجود رہتی لیکن اس نے کبھی رات کے وقت اٹھنے والی صداؤں اور سسکاریوں کی بابت اپنے دوسرے کان کو خبر تک نہ ہونے دی تھی۔ اس لیے کہ وہ شیتل کی وفادار تھی۔ وہ پورے محل کی واحد ہستی تھی جسے ارون کپڑا کے ملکہ کی خواب گاہ میں موجود ہونے کے دوران اندر آنے کی اجازت تھی۔

شیتل اور ارون کپڑا کا شاخسانہ صبح کی گھڑسواری سے شروع ہوا تھا اب پورے دن اور رات پر محیط ہو گیا تھا۔ کسی بھی لمحے ارون کپڑا ایک ہاتھ میں کتابوں اور پروگریس رپورٹوں کے بنڈل اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا سے آزادانہ طور پر ملکہ کے کمرہ خاص میں آ جاتا۔ بہانہ ملکہ سے بچوں کی تعلیم کے موضوع پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ لیکن یہ الگ بات تھی کہ کبھی بریف کیس نہیں کھلتا تھا البتہ ناریت کی یہ ذمہ داری تھی کہ ارون کپڑا کے جانے کے بعد وہ شکن آلود چادریں ضرور بدل دے۔

ناریت نے چائے بنا کر ملکہ کو پیش کی جواب تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ دونوں عورتوں نے آپس میں کسی ٹھلے کا تبادلہ نہیں کیا تھا۔ ناریت خاموشی سے باہر نکل گئی اور ملکہ کو ارون کی روانگی کے وقت ہونے والی بات چیت یاد آ گئی۔ آج وہ اپنے مستقبل کے بارے

میں بڑا پریشان تھا۔

”پورے محل کو میرے اور تمہارے تعلقات کا علم ہو چکا ہے۔ شیتل۔“ تنہائی میں وہ ملکہ کو اس کے نام سے ہی مخاطب کرتا تھا۔ ”کسی دن بھی شاہ کی تلوار میرا سر قلم کر سکتی ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہماری زندگیاں کب تک اس ڈگر پر چلتی رہیں گی۔ تمہارا مستقبل کیا ہوگا؟ کریم، لی روزی جا چکا ہے۔ اگلے چند سالوں میں باقی بچے بھی سوئس اسکولوں میں چلے جائیں گے۔ پبلز اسکول بند ہو جائے گا اور میرا کام بھی ختم ہو جائے گا؟“

اُس نے کسی بلی کی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے محبوب کو دیکھا تھا۔ ”ایک وقت میں ایک شے، ارون۔۔۔ صبر کرو، کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“

اور ارون صبر کے میٹھے پھل کی آس لگائے، سر جھکا کر باہر نکل گیا تھا۔

اُس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر دوبارہ گھڑی دیکھی ایک گھنٹے بعد اُسے بھارتی ٹیلی ویژن دُور درشن کی ایک ٹیم سے ملاقات کرنی تھی۔

دُور درشن کی ٹیم بحریہ کی ملکہ کے ساتھ، جسے بھارت کے رہنے والے اب بھی ہندو ملکہ کے نام سے یاد کرتے تھے، کچھ وقت محل میں گزارنا چاہتی تھی تاکہ وہ اپنے نیٹ ورک پر بھارتی عوام کو اس کے رہن سہن سے آگاہ کر سکے۔ دُور درشن کے ڈائریکٹر جنرل نے اس سلسلے میں محل کے پریس سیکرٹری حامد آجیل کو ایک خط تحریر کیا تھا۔

”دُور درشن، رامیر اور شیتل کی شادی کی جو ملی تقریبات کے سلسلے میں ملکہ شیتل آف بحریہ کا انٹرویو محل میں ریکارڈ کرنا چاہتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ملکہ محل کے بارے میں عام لوگوں کو تفصیلات بتائیں تاکہ انہیں شاہی زندگی اور شاہی رہن سہن سے آگاہی ہو سکے۔ اس طرح کے دوروں کا اہتمام جیکو لین کنیڈی نے وائٹ ہاؤس اور پرنس گریس کیلی نے مٹاکو کے شاہی محل کے لیے بھی کیا تھا۔“

ملکہ کو تجویز پسند آئی اور اُس نے فوراً اس کی منظوری دے دی تھی چنانچہ آج دُور درشن کی ٹیم اسی سلسلے میں محل میں موجود تھی۔

ملکہ نے کرسی سے اُٹھ کر کسل مندی دور کی اور تیار ہونے کے لیے ڈیرنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ سیب جیسی ہری رنگت کا اسکرٹ اور اسی سے ملتا جلتا بلاؤز پہنے میڑھیاں اُتر کر غلی منزل پر جارہی تھی جہاں دُور درشن کی ٹیم اس کی منتظر تھی۔

اُس نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا تھا اور کسی قسم کی جیولری استعمال نہیں کی تھی۔ یہ اس کا اپنا اسٹائل تھا جو بحریہ کی عورتوں میں بے حد مقبول ہوا تھا وہ بہت ہی خاص تقریبات کے علاوہ سادے لباس میں عوام کے سامنے جایا کرتی تھی۔

ٹیلی ویژن آلات ایک ہال نما کمرے میں فٹ کیے گئے تھے۔ پورا کمرہ تیز روشنیوں

سے جگمگا رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تمام افراد نے اُٹھ کر اُسے تعظیم پیش کی۔ انٹرویو ٹیم کے سربراہ سہاش گانیکوں سے اُس کا تعارف کرایا گیا اور شیتل قدم بہ قدم چلتی اپنے لیے مخصوص طلائی کرسی پر جا بیٹھی۔

”پندرہ سال، یورمجی۔ اتنا لمبا عرصہ گزار کر کیسا لگتا ہے؟“ سہاش نے بات چیت کا آغاز کیا۔

”کل کی بات لگتی ہے۔“ شیتل کے سبب کی قاشوں جیسے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”پندرہ سال ایک خواب کی طرح گزر گئے ہیں۔“

”بے شک یہ خوبصورت خواب ہی ہوگا، یورمجی، اور ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں بھی اس خوبصورت خواب کا ایک حصہ بنایا ہے، آپ کی اور شاہ کی کامیاب ترین ازدواجی زندگی میں محبتوں کے تین پھول بھی کھلے ہیں، اُن کی عمر کتنی ہے یورمجی؟“

”ولی عہد کریم چودہ سال کا ہے وہ سوئٹزرلینڈ کے ایک اسکول میں زیرِ تعلیم ہے وہ ہمیں بے حد یاد آتا ہے۔ پرنس جنید گیارہ سال کا ہے جب کہ ہماری بیٹی شہزادی نریام ابھی آٹھ سال کی ہوئی ہے۔“

”ہم نے سنا ہے کہ آپ بحریت کے لوگوں کی معاشی ترقی کے لیے محنت کر رہی ہیں۔ کیا اس بارے میں ہمیں کچھ بتائیں گی؟“

”کیوں نہیں؟“ شیتل نے خالص پیشہ ورانہ انداز اختیار کیا۔ ”پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ بحریت ہنوز ایک ترقی پذیر ملک ہے اور ابھی ہمیں مغرب کا ہم پلہ ہونے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ تعلیم، صحت عامہ اور رہائشی سہولتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ میں اور میرے شوہر ان علاقوں کا تعین کرتے ہیں جنہیں ہماری توجہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ چونکہ امور سلطنت میں بُری طرح اُلجھے رہتے ہیں اس لیے میں ہی اُن کے کان اور آنکھیں ہوں۔ میں ملک کا دورہ کر کے لوگوں کی ضروریات اور مسائل کا جائزہ لیتی ہوں پھر ان کی سفارشات مرتب کرتی ہوں اور بعد ازاں ان پر عمل درآمد ہوتا ہے۔“

”کیا شاہ آپ سے سفارشی معاملات پر بھی مشورے لیتے ہیں؟“

”شاؤنا دور۔“ شیتل نے اپنے سبز اسکرپٹ کی فال درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھ سے زیادہ قابل مشیر اُن کے پاس ہیں۔“

”کوئی اور بات جو آپ نے ہمیں نہ بتائی ہو؟“

”میرا تعلق بنیادی طور پر ایک ایسے مُلک سے ہے جہاں بہت سی آزادیاں حاصل ہیں لیکن عورت کے معاملے میں ہندو معاشرہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ مسلمان، البتہ مسلمانوں میں سختیاں کچھ زیادہ ہیں۔ قود کی نوعیت کچھ سخت ہے۔ اس لیے ہماری عورتیں صدیوں سے مردوں کی غلامی کرتی چلی آئی ہیں۔ بحریت میں بھی صورت حال یہی تھی لیکن اب کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ میں نے بہت سی تجاویز مرتب کر کے اپنے شوہر کو پیش کیں اور انہوں نے ان کی منظوری بھی دی۔ ان کے اثرات بھی بہت بہتر مرتب ہوئے ہیں۔“

”مثال کے طور پر؟“

”اپنی طویل ترین تاریخ میں پہلی مرتبہ بحریت کی خواتین، ڈاکٹرز، دلاء، پروفیسرز اور ماہرین معاشیات حتیٰ کہ ٹی وی اناؤنسرز اور کنٹینٹرز تک بن رہی ہیں۔“

”شکریہ، یور میسجی“ سہاش نے انٹرویو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ ہمیں اور ہمارے ناظرین کو محل کی سیر نہیں کرائیں گی؟“

”کیوں نہیں؟“ شیتل کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آئیے؟“ کیمرا کریو اپنے آلات سینے میں لگ گیا اور سہاش گائیڈوں کی طرح قریب ہو گیا۔

”پرانے دن کتنے اچھے تھے مس شیتل؟“ اس نے اچانک سرگوشی کی۔ ”کیا میں آپ کو یاد ہوں۔“

شیتل نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

”آپ کو یقیناً یاد ہوگا۔“ سہاش نے خود ہی بات جاری رکھی۔ ”میں آکاش اسٹوڈیوز میں کام کرتا تھا۔ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں، کیا آپ کو راہول یاد ہے؟ میں اس کا اسٹنٹ تھا آپ کی آخری فلم ’سائے‘ جس میں آپ نے انیل کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ اُس کی ساری پبلسٹی فلمیں میں نے تیار کی تھیں۔ کیا آپ کو وہ پرانے دن یاد آتے ہیں؟“

”آپ کا سوال اسکرپٹ میں تو شامل نہیں تھا مسٹر سہاش۔“ شیتل نے کڑے



تیوروں سے اُسے گھورا۔

”معافی چاہتا ہوں، یوریمبجٹی۔“

”اور میری لغت میں معافی کا لفظ نہیں ہے مسٹر!“ شیتل غزائی۔ ”محرم اگر غلطی کرنا اپنا حق سمجھتا ہے تو میں اُسے سزا دینا اپنا حق تصور کرتی ہوں، ذہن میں رکھئے گا کہ میں پرانے دنوں کو ایسے بھول چکی ہوں جیسے آپ لوگ شمشان گھاٹ میں چتا جلا کر مُردے کو بھول جاتے ہیں۔“

شیتل نیک نیک کرتی چل دی۔ سہاش اور ٹی وی کر یو اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ شیتل نے انہیں اسٹیٹ ڈرائنگ روم، کچن، چھوٹے اور بڑے بال روم، جننازیم، انڈورسومنگ پول شاہی اسپتال، عجائب گھر، جڑیا گھر اور شاہی خواب گاہ کی سیر کرائی لیکن اُس کا موڈ آخر وقت تک آف رہا۔

ملکہ شیتل رامیر ہواؤں کے دوش پر تھی۔

بحریت اُردو کا شاہی طیارہ ریال سے پیرس کی جانب محو پرواز تھا۔ اس بار وہ کسی سرکاری مشن پر نہیں بلکہ انتہائی نجی دورے پر پیرس جا رہی تھی۔ یوں تو ملکہ کی حیثیت سے اسے بہت سی تقریبات میں جانا پڑتا تھا لیکن اکثر و بیشتر وہ پور ہوا کرتی تھی جیسے گزشتہ دنوں اس نے ایک برطانوی شہزادے کی شادی میں رامیر کی نمائندگی کی اور ایک ایسے وزیر اعظم کی آخری رسومات میں شریک ہوئی جس سے وہ زندگی میں کبھی نہیں ملی تھی۔ ایک بار رامیر نے اسے جنوبی افریقہ کے انتہائی پسماندہ ملک کے مطالعاتی دورے پر بھیج دیا تھا۔ اور وہ پورے دورے کے دوران اُسے کوستی رہی تھی۔

آج کی پرواز مختلف تھی۔ اسے اس بار کوئی شاہی فرض ادا نہیں کرنا تھا۔ بلکہ وہ ذاتی دورے پر پیرس جا رہی تھی اور خوش قسمتی سے رامیر نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا تھا کیونکہ اُسے علم تھا کہ جانے سے پہلے یا آنے کے بعد شیتل کسی قسم کے غیر معمولی مطالبات نہیں کرے گی۔ پھر اُسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اُس کی بیٹی اور شیتل میں بڑے گہرے مراسم قائم ہو گئے تھے۔

شہزادی اریبہ زاہدی، شاہ رامیر کی پہلی بیوی کے بطن سے تھی۔ وہ انیس سال کی تھی اور سارہ یون میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اریبہ بہت سے مسائل میں گھری رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے باپ کو یہ مسائل حل کرنے کی فرصت نہیں تھی لیکن اس کے مسائل کو شیتل نے اپنے مسائل سمجھ لیا تھا اور اب وہ اُسی سے ملنے پیرس جا رہی تھی۔

شیتل اس وقت شاہی جیٹ کے لاؤنج ایریا میں ریشم سے ڈھکی ایک کرسی پر براجمان تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس اسٹیورڈ فریڈی نے نارنٹی کا گلاس لاکرا سے تھمایا اور وہ اُس کی چسکیاں لیتی ہوئی فریڈی کے بارے میں سوچنے لگی۔

سرخ بالوں والے فریڈی کا اپنے کریومبر کی حیثیت سے تقرر شیتل نے ہی کیا تھا۔  
جہاز سے باہر وہ مالک اور ملازم نہیں بلکہ دوست ہوتے تھے۔ اور یہ فریڈی تھا جو خود شیتل کے  
علاوہ یہ بات جانتا تھا کہ وہ پیرس کیوں جاتی ہے؟

”ائر پورٹ پر کون مل رہا ہے، یور میجسٹی؟“ فریڈی نے دریافت کیا۔  
”شہزادی اریبہ۔“

”خوشی ہوئی سن کر، یقیناً آپ کا وقت اچھا گزرے گا۔“  
”شاید نہیں۔“ شیتل نے مارٹینی کی چمکی لی۔ ”وہ اپنے مسائل میں گھری ہوئی ہے۔  
کل ہم دونوں قومی بجٹ خرچ کرنے جو ملی تقریبات میں جائیں گے، دکھانا رکھنا۔“  
”اور اگلے روز؟“

”ڈاکٹر لیزکس، پرانا وقت۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ فریڈی نے جواب دیا۔

شیتل جب پہلی مرتبہ بحریت گئی۔ اریبہ اُس وقت چار سال کی تھی اس کے باوجود کہ شادی میں کئی ماہ تھے رامیر کا اصرار تھا کہ وہ بحریت کا دورہ کرے۔

”اپنے نئے گھر کو اچھی طرح دیکھو شیتل۔“ رامیر نے کہا تھا۔ ”اور پھر میری بیٹی ہے بھی ملنا، جواب تمہاری بھی ہوگی۔“

اور جب رامیر نے اریبہ کا تعارف شیتل سے کرایا تو وہ پلٹ کر اپنے باپ کے بازوؤں میں چھپ گئی تھی۔ شادی کے ہنگاموں اور وہنی مون کی خرمستیوں کے بعد شیتل نے اریبہ پر توجہ دینی شروع کی اور پھر دونوں میں دوستی مضبوط ہوتی چلی گئی۔ شہزادہ کریم کی پیدائش کے بعد رامیر کی جو تھوڑی بہت توجہ اریبہ پر تھی وہ بھی ختم ہو گئی لیکن شیتل نے اپنی توجہ ڈگنی کر دی۔

پہلے شہزادہ کریم نے جنم لیا۔ پھر شہزادہ جنید اور تیسری بیٹی شہزادی نریام تھی۔ شیتل کو پورے ملک میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن مادر بادشاہ کا اب بھی یہی خیال تھا کہ رامیر نے ایک ہندو لڑکی کو ملکہ بنا کر اچھا نہیں کیا۔

رامیر کی بڑی بہن عذرا البیہ غیر جانبدار تھی اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوئزر لینڈ اور فرانس میں رہتی تھی۔ اُسے اپنے نو جوان دوستوں اور محبوبوں سے ہی اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ بحریت کے معاملات میں دخل دیتی لیکن اس کے باوجود اُس نے شیتل کی زندگی بدل دی تھی۔ پانی کا وہ بلبلا اُسی نے پھوڑا تھا جسے شیتل اپنے سر کی چھت سمجھے بیٹھی تھی۔

سوئٹزرلینڈ دنیا کا خوب صورت ترین ملک ہی نہیں ہے بلکہ یہاں ایسے مہنگے ہوٹل، ٹائٹ کلب اور دوسری تفریح گاہیں بھی ہیں جہاں ایک عام امیر آدمی جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کوہ الپس کی حسین وادیاں جنہیں ”اسکائنگ کی جنت“ کہا جاسکتا ہے ایسے ہوٹلوں کلبوں اور تفریح گاہوں سے اُٹی پڑی ہیں۔ شاہ رامیر، الپس کی ان جنت نظیر وادیوں میں وسیع و عریض جائیداد کا مالک تھا جس میں خوبصورت محل کے علاوہ کئی ہوٹل، کلب اور جوئے خانے شامل تھے۔

شیتل شادی کے بعد جب پہلی بار سوئٹزرلینڈ گئی تو حیران رہ گئی۔ وہ خود بھی پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا اور دُرُور دنک برف کی چادر تھی ہوئی تھی۔ شیتل خوبصورتی دیکھ کر پلکیں جھپکائی بھول گئی تھی۔ شاہی جوڑا اُٹھتیاں گزارنے یہاں آیا تھا۔ سینٹ موریز کی باقی خوبصورتی تو اپنی جگہ، شاہی محل ہی اتنا دیدہ زیب تھا کہ شیتل کے پاس اُس کی تعریف کے الفاظ نہیں تھے۔

”لیکن یہ اتنے بہت سے تاروں اور انٹینا کا یہاں کیا کام؟“ شیتل نے حیرت سے

پوچھا۔

”یہ ریال سے رابطے کے لیے شارٹ ویو انٹینا ہے۔“ رامیر نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ

سے کسی بھی وقت رابطہ کر سکتے ہیں۔“

”لیکن ہم تو جھٹپوں پر ہیں؟“ شیتل نے اسے یاد دلایا۔

”ہم ہیں۔ اور اُٹھتیاں ہی گزاریں گے، سوائے دوپہر کے چند گھنٹوں کے۔“

”اس کا کیا مصرف ہوگا؟“

”میں سووریا ہاؤس جایا کروں گا۔“

”سووریا ہاؤس۔۔۔ یہ کیا ہے؟“

”ہم اُسے پیچھے سڑک کے کنارے چھوڑ آئے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا ہوٹل ہے لیکن ہم جیسے بڑے لوگوں کے لیے نہیں۔“

”آپ یہاں کام کیوں نہیں کر سکتے؟“ شیتل نے احتجاج کیا۔

”چھٹی کے دن میں وہاں کام نہیں کرتا جہاں سوتا ہوں۔ یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوگی۔ لوگوں کا آنا جانا، ٹیلی فون کی گھنٹیاں، احکامات کا شور۔۔۔ تم پریشان ہو جاؤ گی۔ پھر سو ریٹا میں میرا پورا اسٹاف موجود ہے اور وہاں محل سے زیادہ جدید ترین ہائی فریکوئنسی ایکوپمنٹ نصب ہیں۔“

اس نے دونوں ہاتھوں میں شیتل کا چہرہ تھام لیا۔

”تم نے کسی تاجر سے شادی نہیں کی، جان، ایک بادشاہ اپنی دکان مہینے بھر کے لیے بند کر کے چابی کنویں میں نہیں پھینک سکتا۔ دن بھر میں چند گھنٹوں کی تو بات ہے پھر میں ہوں گا، تم ہوگی اور۔۔۔ اور۔۔۔“

شاہ کا جملہ پورا نہیں ہوا۔ شیتل نے اُس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر دی۔

”میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔“ وہ گنگنائی۔

”اور میں پرستش، میری دیوی۔“ شاہ نے جواب دیا اور شیتل سب شکوے بھول گئی۔

اُس نے شاہ کے معمولات کو قبول کر لیا تھا۔

پھر ملکہ اور شاہ ہر سال یہاں آنے لگے۔ سینٹ موریز اب شیتل کے لیے دوسرا گھر بن گیا تھا۔ بچوں کی پیدائش سے بھی اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ جونہی چھٹیاں شروع ہوتیں شیتل، جہاز کا رخ سویٹزر لینڈ کی طرف موڑنے کی ہدایت کر دیتی۔

سویٹزر لینڈ میں اُن کے معمولات اب مخصوص ہو چکے تھے۔ صبح سویرے شاہ اور ملکہ بچوں کے ہمراہ ناشتا کرتے جس کے بعد بچے بد فانی سوٹ اور پار کا پہن کر اپنے انسٹرکٹرز کے ہمراہ اسکاٹنگ کے لیے نکل جاتے۔ اگر شاہ اور ملکہ رات کو دیر تک کسی کلب یا تقریب میں مصروف رہتے تو وہ ناشتے کے بعد اپنی نیند پوری کرتے ورنہ وہ بھی اپنے انسٹرکٹرز کے ہمراہ اسکاٹنگ کرتے، دوستوں سے گپ شپ ہوتی اور دوپہر کے کھانے کے بعد شاہ، سودریٹا ہاؤس چلا جاتا۔

شیتل نے سویٹزر لینڈ میں بڑے حسین دن گزارے۔ کئی جگہوں کے ساتھ اس کی بڑی انوکھی اور ناقابل فراموش یادیں وابستہ تھیں۔ وہ لمحات جو اس نے رامیر کے سنگ گزارے تھے اس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ کبھی کبھار تو رامیر، تیار ہونے کے باوجود شیتل کو اسکاٹنگ کے لیے نہیں جانے دیتا تھا۔ بقول اس کے پیار کے لمحات، اسکاٹنگ کے لمحات سے زیادہ قیمتی اور رنگین ہوتے ہیں۔

لیکن پیار کے انہی سرور بخش اور رنگین لمحات نے شیتل کو ڈس لیا۔ شیتل کو وہ صبح آج تک نہیں بھولی تھی جب رامیر نے شدت جذبات سے بے اختیار ہو کر مدہوشی کی حالت میں کسی اور عورت کا نام لیا تھا۔ شیتل خود بھی ایسی کیفیت سے دو چار تھی۔ لیکن اس کا پورا بدن کھنچاؤ کا شکار ہو گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہیں کیا پریشان کر رہا ہے۔“ رامیر نے بعد میں اس سے کہا تھا۔  
 ”اُسے بھول جاؤ۔“

”میں نہیں سمجھ سکی کہ۔۔۔۔“

”یہ پیار کرنے والوں کے خیالی پلاؤ ہوتے ہیں، اس کا کوئی مطلب نہیں، دُنیا میں

میرے لیے بس ایک ہی شیتل ہے۔“

لیکن شیتل کو یہ خیالی پلاؤ ہضم نہ ہو سکا۔ اچانک ہی وہ ایسی محبوبہ بن گئی تھی جو اپنے

محبوب سے پہلی مرتبہ ملی ہو۔

oo



غیر محسوس طریقے سے دونوں کی راہیں جدا ہو گئی تھیں رامیر معمول کے مطابق سووریا ہاؤس میں امور سلطنت کی انجام دہی کو چلا جاتا جب کہ وہ محل میں رہتی۔ سوتی، پڑھتی اور بچوں کے ساتھ مصروف رہ کر وقت گزارا کرتی۔ اس کے باوجود وہ یہی کوشش کرتی کہ رامیر اُس پر توجہ دے یا نہ دے اس کے اپنے پیار میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ رامیر کی واپسی سے پہلے وہ تیار ہوتی اور گزشتہ روز سے زیادہ خوبصورت لباس زیب تن کرتی تاکہ رامیر زیادہ سے زیادہ متاثر ہو۔

رامیر بھی شام کو سووریا ہاؤس سے واپسی پر زیادہ وقت اُسی کی معیت میں گزارتا لیکن شیتل کے سینے پر پتھر کی سل، جو اس رات رکھی گئی تھی وہ کبھی نہ ہٹ سکی۔ اُس شب رامیر اپنی اسٹڈی میں موجود تھا۔ شیتل نے معمول کے مطابق بچوں کو دودھ کے گلاس دیے اور انہیں شب بخیر کہتی ہوئی رامیر کے پاس جانے کے لیے میز حیاں چڑھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسٹڈی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی بعض آوازوں نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

پہلی آواز رامیر کی تھی جو اسٹڈی کے بند دروازے کے پیچھے سے ہی آئی تھی۔ رامیر کا لہجہ غصے سے بھرپور تھا۔

”تم نے ایسا کام کیا ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا۔“

”میرے پیارے بھائی۔“ دوسری آواز ابھری۔ شیتل نے فوراً پہچان لیا وہ شہزادی

عذرا تھی۔ ”تم اس صورت حال سے بہ آسانی نمٹ سکتے ہو۔“

”مگر تم نے ایسا کیوں کیا۔“

”اس لیے کہ مجھے رقم کی ضرورت تھی۔“ شہزادی عذرا نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اور میں جو تمہیں شاہی الاؤنس دیتا۔۔۔۔۔“

”وہ میری ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔“ شہزادی نے اپنے بھائی کی بات کاٹ دی۔

”تمہارے یا تمہارے نئے نئے دوستوں کے لیے؟“ رامیر بُری طرح دہاڑ رہا تھا۔  
 ”تم میری بڑی بہن ہو۔ تم نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“  
 ”کیا اس سے پہلے تم منہ دکھانے کے قابل تھے۔“ شہزادی عذرانے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں تو صرف ہیرن اسمگل کرتے پکڑی گئی ہوں تم تو اس سے بدتر کاموں میں ملوث رہے ہو۔ تم کہتے ہو میرے دوست قیمتی ہیں، بے شک وہ ہیں لیکن تمہاری دوستوں سے زیادہ نہیں۔“

شیتل کو شہزادی کے جملے کے جواب میں کسی کے زخسار پر ایک زوردار تھپڑ لگنے کی آواز سنائی دی جس کے فوراً بعد شہزادی کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ شیتل نے فوراً ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنا چاہا لیکن اگلی آواز نے دوبارہ اس کے قدم جکڑ لیے۔

”تم سمجھتے ہو کہ تمہارے معاشرے کسی سے مخفی ہیں۔“ شہزادی عذرانے سسکیاں لیتی آواز پھر ابھری۔ ”تم امورِ سلطنت کی آڑ میں سو دریا ہاؤس میں دنیا کی جن مہنگی ترین عورتوں سے ملتے ہو، زمانہ اُن کے بارے میں جانتا ہے۔ جنرل مجیب اور اس کے ماتحت گتے تمہاری جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ بھی میرے علم میں ہیں۔۔۔۔۔“  
 ”خاموش رہو!“ رامیر حلق کے بل دہاڑا۔

”ابھی سے؟“ شہزادی عذرانے سحجبانہ انداز میں کہا۔ ”ہمبرگ کی مار تھا اور گزشتہ ہفتے اُس کی بہن ہیلگا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اور وہ ڈینش لڑکی، جس کی عمر ابھی سولہ سال بھی نہ تھی؟ کیا تم نے انہیں روکیس طلائی گھڑیاں نہیں دلوائیں؟ پیرس میں جنرل مجیب کے اکاؤنٹ سے یہ ادا نیکیاں کی گئی ہیں۔۔۔۔۔“

”خاموش۔“ شیتل کو دوبارہ رامیر کی غصے میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ”شیتل اور بچے گھر پر موجود ہیں تمہاری آواز اُن تک بھی پہنچ سکتی ہے۔“

”صرف ایک شرط پر، سوئس پولیس سے میری جان بچھڑا دو۔“  
 ”میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا، یہاں میں بادشاہ نہیں ہوں، سوئٹزر لینڈ میں منشیات کی نقل

و حمل موت سے زیادہ بڑا جرم ہے اگر میں انہیں تمہارے خلاف الزامات واپس لینے کو کہوں گا تو وہ تمہیں دوبارہ کبھی سوئٹزر لینڈ میں داخل بھی نہیں ہونے دیں گے۔“  
 ”وہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال میری جان چھوڑو، میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور میرا آخری مطالبہ۔۔۔۔۔“

”اب میں کوئی بکو اس نہیں سنوں گا۔“  
 ”میرے سابقہ الاؤنس بحال کر دو۔“ شہزادی نے بھائی کے مجملے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی ”اگر نہیں تو میں بحریہ سے لے کر امریکہ تک تمہارے کردار کا پول کھول دوں گی۔“  
 شیتل نے ایک اور تھپڑ کی آواز سنی۔  
 ”میری نظروں سے دور ہو جاؤ عذرا۔“ وہ غزایا۔ ”تمہارا الاؤنس تمہیں مل جائے گا لیکن میں اب تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“  
 ”تھینک یو، یور میسٹی، میزاکاؤنٹ کریڈٹ سوکس ہے۔“ شہزادی عذرا کا جواب سنائی

دیا۔  
 اس کے ساتھ ہی دروازہ غیر مقفل ہوا اور اچانک کھل گیا۔ شیتل کو اپنے سامنے دیکھ کر شہزادی کا سانس حلق میں اٹک گیا۔  
 ”تو تم نے سب سن لیا بھائی۔“ اس نے ایک لمبی سانس لی اور کندھے اچکا دیے۔  
 ”ویسے اچھا ہوا، دنیا میں تم اکیلی ہی تھیں جسے ان باتوں کا علم نہیں تھا۔“  
 شیتل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں ساکت تھیں۔ اس کا بدن لڑکھڑایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہوتی، رامیر نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

شیتل بیڈ پر کشن کے سہارے نیم دراز تھی۔ رامیر ڈریننگ گاؤن پہنے آرام کرسی پر بیٹھا اُس کے سامنے تھا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ رات کتنی بیت چکی ہے اور وہ کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔

”شیتل۔“ رامیر نے آگے بڑھ کر اس کے منہ ہاتھوں کو تھام لیا۔ ”عذرا، ہمیشہ اسی طرح لڑتی ہے، بچوں کی طرح، وہ مجھ سے جیلس ہے کیونکہ لوگ اس کی نسبت مجھے زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

”جو کچھ شہزادی نے کہا، وہ صحیح تھا۔“ شیتل نے ہچکیاں لیتی آواز میں دریافت کیا۔  
 ”ہاں!“ رامیر نے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک ایک لفظ سچ تھا۔ اب جھوٹ بولنے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے تم غلط سمجھ جاؤ یا تمہیں دکھ ہو؟“  
 ”ہو سکتا ہے، کا کیا سوال ہے؟“ شیتل کو اپنی آواز بھی اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔  
 ”بالکل کیونکہ تمہارے خیال میں میری نظر میں اُن عورتوں کی بڑی اہمیت ہوگی، حالانکہ ایسا نہیں۔“

”مگر ایسا بھی کیوں؟“ شیتل کی آواز بلند ہو گئی۔ ”سوتن صرف سوتن ہوتی ہے اس میں اہم اور غیر اہم کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔“

”اُن میں کوئی اتنی اہم نہیں کہ تم اسے اپنے برابر کھڑا کرو۔“ رامیر اپنی بات پر قائم تھا۔  
 ”میرا تعلق ایک مختلف ثقافت سے ہے اور ہمارے ہاں مردوں کے معاملات خاص طور پر شاہوں کے معاملات ذرا مختلف ہیں۔“

”میں تو سمجھتی تھی کہ میں نے آپ کو بدل دیا ہے۔“  
 ”میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے اور بچوں نے مجھے اتنی خوشی دی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ تم میری ملکہ ہو، میری بیوی ہو اور ہم زندگی بھر کے ساتھی ہیں۔“

”اور دوسری عورتیں؟“

”میں نے کہا انہیں بھول جاؤ۔“ رامیر نے زچ ہو کر کہا۔ ”تمہارا اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔“

شیتل خاموش ہو گئی لیکن خوشی سے نہیں بلکہ سینے پر مجبور یوں کی بھاری سل رکھ کر۔ شہزادی عذرا چلی گئی اور رامیر نے اس کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ خود شیتل سے اس موضوع پر اُس کی مزید کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے معمولات میں کوئی فرق آیا تھا۔

ہر روز اپنے محافظوں کے ہمراہ وہ لمبی چوڑی سیاہ لیوزین میں سلطنت کے نام نہاد امور نمٹانے سو دریا ہاؤس جاتا اور شیتل محل کی کسی کھڑکی کی آڑ میں کھڑی نمناک آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہتی۔

کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر وہ آنسو بھی بہاتی۔ خود کو کوستی اور لعنت ملامت کرتی۔ اُسے شک تھا کہ سارا سینٹ موریز اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ اور اس کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتا ہے۔ اُسے اپنے قریبی دوستوں کی آنکھوں میں بھی شک و شبہ کی پرچھائیاں رقص کرتی دکھائی دیتیں۔

بسا اوقات وہ خود کو یاد دلاتی کہ وہ ایک اداکارہ تھی، اُسے ہر طرح کے ماحول سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت ملی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا سر بلند ہو جاتا۔ اس کی زندگی میں پہلے بھی ایسے لوگ آئے تھے جنہیں اُس نے دھکا مارا تھا، اسکول کے دن، پھر فلمی دنیا۔۔۔ اور اب رامیر۔۔۔ ہاں رامیر نے بھی تو اس کے ساتھ زیادتی کی تھی لیکن یہ جسمانی نہیں تھی۔ یہ زیادتی ذہنی تھی۔ اُس نے اُس کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچتی کہ اُس نے اپنا سب کچھ رامیر کو سونپ دیا تھا۔ اپنی پرانی راہیں اور پرانی سرگرمیاں چھوڑ کر دل و جان سے اس کی ہو گئی تھی لیکن غداری خود رامیر نے کی، اس کی ذات میں نقب لگانے کی کوشش کی تھی۔

اب وہ ایک کھوکھلی عورت تھی۔ اسے رامیر نے کھوکھلا کیا تھا۔ وہ اُس کا مجرم تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ اس کے لیے وہ رامیر کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

”آپ ڈاکٹر لیز کس سے اپنا معائنہ کرائیں، یورمجسٹی۔“ ایلیدہ امیر ڈ نے شیتل کو مشورہ دیا۔ ایلیدہ، کورڈیجیلیا ریسورنٹ کی مالکہ تھی اور شیتل اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اکثر کورڈیجیلیا کے پرسکون گوشوں میں پناہ لیا کرتی تھی۔ تنہائی کے ایسے ہی لمحات نے ایلیدہ کو شیتل سے قریب کر دیا تھا۔

”ڈاکٹر لیز کس؟“ شیتل نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”پیرس کی مشہور و معروف سائیکائٹریسٹ۔“ ایلیدہ نے جواب دیا۔ ”وہ عورتوں کو جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ میں خود بھی کبھی مایوسیوں اور محرومیوں کے اندھے گڑھوں میں مقید تھی لیکن پھر میری ملاقات ڈاکٹر لیز کس سے ہوئی اور اُس نے میری کایا پلٹ ڈالی۔۔۔“

ایلیدہ، شیتل کو اپنے تجربات بتاتی رہی کہ کس طرح وہ شوہر کی محکوم ہوا کرتی تھی اور کس طرح ڈاکٹر لیز کس نے اُس کے اندر یہ احساس اجاگر کیا کہ عورت کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ شیتل، ایلیدہ کی کہانی غور سے سنتی رہی۔ جب اُس نے کہانی ختم کی تو شیتل بھی اپنے تئیں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

”کیا تم ڈاکٹر لیز کس سے میری ملاقات کا اہتمام کر سکتی ہو؟“ شیتل نے سوال کیا۔

”میں اکثر پیرس جاتی رہتی ہوں۔“

”بسروچشم ملکہ عالیہ!“ ایلیدہ نے سرخم کرتے ہوئے جواب دیا۔

اور ڈاکٹر لیز کس کی معیت نے واقعی شیتل کو جینے کا نیا ڈھنگ سکھایا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے احساس دلایا تھا کہ اب وہ سری نگر کی شیتلا کلاوتی موہن نہیں بلکہ دنیا کے ایک طاقت ور ملک کی ملکہ شیتل رامیر ہے۔ اب شیتل، اس قابل ہو گئی تھی کہ اپنے طور پر کوئی اہم فیصلہ کر سکے لیکن اس نے اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کا پروگرام جو بلی تقریب کے بعد کا بنایا تھا جب کم از کم اُس کا اپنا مستقبل تانناک ہو سکتا تھا۔

”ہم فرنیچ اپس پر چو پرواز ہیں ملکہ عالیہ۔“ فریڈی کی آواز اُسے ماضی سے حال میں کھینچ لائی۔ ”اور اگلے ایک گھنٹے میں پیرس کے لی بورگٹ ائر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ کیا آپ سینڈوچ پسند کریں گی؟“

”نہیں میں اریبہ کے ساتھ لنچ کروں گی۔“ شیتل نے جواب دیا اور فریڈی سرخم کر کے واپس مڑ گیا۔

اگلا ایک گھنٹہ شیتل نے خود کو اریبہ سے ملاقات کے لیے تیار کرنے میں گزارا۔ انیس سالہ اریبہ اس کے بے حد قریب تھی لیکن اس نے اب تک ڈاکٹر لیزکس کے معاملے میں اُسے اعتماد میں نہیں لیا تھا، شاہی اسٹاف میں سے صرف فریڈی جانتا تھا کہ ملکہ شیتل پیرس میں اپنا وقت کہاں گزارتی ہے؟

یہ ڈاکٹر لیزکس کی مہربانیاں ہی تھیں جنہوں نے شیتل کو ایک دورا ہے پر لاکھڑا کیا تھا۔ وہ اصل راستے کے بارے میں جانتی تھی کہ اُسے کس کا انتخاب کرنا ہے۔ رامیر کے ساتھ اُس کے تعلقات برائے نام رہ گئے تھے اور بظاہر اب دونوں کو ہی اس بات سے غرض نہیں تھی کہ کون اپنا وقت کہاں گزارتا ہے لیکن ابھی شیتل کو اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے کچھ مہلت درکار تھی۔

شیتل نے سر جھٹکا۔ ذہنی آواز، اریبہ سے ہوتی ہوئی رامیر تک جا پہنچی تھی۔ اس نے پھر اریبہ اور اُس کے موجودہ دوست ریکس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ گزشتہ بار جب اریبہ نے پیرس سے فون کیا تو شیتل کو اس کی آواز میں خوف اور غیر یقینی کی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔

شیتل نے دل ہی دل میں اریبہ کی دوستی کے انداز اور اس کے دوستوں کے بارے میں غور شروع کیا۔ پہلے اس کی دوستی ایک شادی شدہ جوگی سے تھی جس سے اُس کی ملاقات

اوٹلی میں ہوئی تھی۔ پھر وہ ایک مکینک کو دل دے بیٹھی جس کے بارے میں اس بے وقوف کو یقین تھا کہ وہ اُسے بدل لے گی۔ بعد میں ایک برطانوی راک موسیقار اس کی زندگی میں داخل ہوا جس نے پہلی مرتبہ اسے کوکین کے ذائقے سے آشنا کیا۔ ایک برطانوی کاؤنٹ بھی اریبہ کے دوستوں میں شامل رہا تھا جو اس سے محض اس لیے تعلق رکھنا پسند کرتا تھا کہ وہ ایک شاہ کی بیٹی ہے۔

شیتل کو حیرت تھی کہ آخر جلدی جلدی دوست بدلنے کی وجہ کیا تھی۔ وہ بنیادی طور پر اریبہ کو بے وقوف سمجھتی تھی جو ہر کسی سے پلک جھپکنے میں متاثر ہو جایا کرتی تھی۔ اب اسی ریکس ہولڈن کی مثال شیتل کے سامنے تھی۔ اریبہ کا خیال تھا کہ یہ باقی تمام لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ اس سے پیار کرتی تھی لیکن اس میں بہت سے مسائل اور خطرات تھے۔ اریبہ کے لیے نہیں، ریکس کے لیے۔ وہ اپنے لیے کسی قسم کے محافظ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سختی سے اس کے لیے انکار کر دیا تھا۔ سالوں پہلے اپنے والد سے اُس نے اسی نکتے پر لڑائی مول لی تھی جسے اس نے جیت لیا تھا اب وہ ساربن کی ایک آزاد طالبہ تھی جو لاطینی کوارٹرز میں ریوڈی لایونیورسٹی پر اپنے فلیٹ پر رہتی تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ تمام لوگ اس سے ایک عام طالبہ کا سا سلوک کریں۔

”آپ نے آنٹی کے ساتھ بھی تو ایک قسم کا معاہدہ کر رکھا ہے نا؟“ اس نے اپنے باپ کو اپنی سوتیلی ماں کی مثال دی تھی۔ ”ان پر پابندی صرف امورِ سلطنت کے بارے میں ہے جب کہ نجی زندگی میں وہ آزاد ہیں۔ میرا مطالبہ بھی یہی ہے۔“

”تمہارا مطالبہ۔۔۔؟“

”ہاں۔“ اس نے اپنے باپ کی بات کاٹی۔ ”میں نہ آپ کی جانکاد منقولہ ہوں نہ وارث، مجھے سانس لینے دیجئے۔“ اپنی مرضی سے، مجھ پر اپنے احکامات نہ تھوپیں۔“

”تب پھر جہاں ہو، وہیں رہو۔“ رامیر نے پیر پٹختے ہوئے جواب دیا۔ ”تم پر لے درجے کی ضدی اور بے وقوف لڑکی ہو۔ اگر تم ڈولچی کشتی پر ہی سوار رہنا چاہتی ہو تو میری بلا سے۔“

”تھینک یو، فادر۔“ اریبہ نے خوفزدہ ہونے کے بجائے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔



شاہی طیارے کو لی بورگٹ کی بے نمبر فور پر ٹھہرایا گیا۔ دروازہ کھلنے پر سب سے پہلے شیتل پر نمودار ہوئی۔

”شہزادی دی آئی پی لاؤنچ میں ہوں گی، ملکہ عالیہ۔“ فریڈی نے احترام سے آگاہ کیا۔ ”آپ کا سامان نیویلی پہنچا دیا جائے گا۔ گستاخی معاف پور میجسٹی، وہ پیرس کی ڈبل روٹی بھی وہیں ہوگی؟“

”موریہ؟“ شیتل نے حیرت سے کہا۔ ”فریڈی! مت بھولو کہ وہ ایسی آنٹی ہے جس کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔“

موریہ کیپٹن بیل، ادھیڑ عمر کی ایک بیوہ اسکاٹش عورت تھی۔ جب شیتل نے ملکہ بحریہ کی حیثیت سے امریکہ کا پہلا سرکاری دورہ کیا تھا اس وقت موریہ۔۔۔ واشنگٹن ڈی سی کے بلیئر ہاؤس کی ہاؤس کیپر تھی۔

شاہ رامیر اور ملکہ شیتل کی رہائش کا بندوبست میساچوسٹس پر بحریتی سفارتخانے میں کیا گیا تھا۔ جونہی شاہ کی سواری سفارت خانے پہنچی نو جوانوں کے ایک گروہ نے سفارت خانے پر ہلہ بول دیا۔ ان میں امریکی، بھارتی اور بحریتی طلبہ شامل تھے۔ امریکی محکمہ داخلہ نے شاہی جوڑے کی جانوں کو درپیش خطرے کے پیش نظر متبادل رہائش کی تجویز پیش کی لیکن رامیر نے سفارت خانے میں ہی ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ البتہ محکمہ داخلہ کے چیخنے چنگھاڑنے پر اس نے شیتل کو سرکاری مہمان خانے بلیئر ہاؤس منتقل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

پنسلوینیا ایونیو پر واقع بلیئر ہاؤس میں شیتل کا استقبال مسز موریہ کیپٹن بیل نے کیا تھا۔ جونہی ملکہ اندر داخل ہوئی اس نے بھاگ کر اس کے اپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں بند کر دیں تاکہ باہر سے آنے والے نعروں کی آوازیں ملکہ کو سنائی نہ دے سکیں لیکن نعرے بدستور گونج رہے تھے۔

”قاتل کی سزا، موت ہے۔۔۔ شاہ کی موت ہمارا مقصد ہے۔۔۔ قاتل کو واپس بھیجو۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ شیتل نے نہایت معصومیت سے لیکن خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

”انہیں پتا چل گیا ہے کہ تم یہاں آ چکی ہو۔“ مسز موریا نے اسے بتایا۔ ”یہاں تمہارے خلاف نعرے لگائے جارہے ہیں اور ان کے ساتھیوں نے سفارتخانے پر دھاوا بول رکھا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”وہ شاہ سے نفرت کرتے ہیں، اس کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔“

”انہیں یہاں سے نکال کیوں نہیں دیا جاتا؟“

”یہ ایک آزاد مملکت ہے، ملکہ۔“ مسز موریا نے جواب دیا۔

”لیکن یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ بحریہ میں حکومتی ڈھانچہ امریکہ سے قطعی مختلف ہے۔ شاہ

تمہا حکمران ضرور ہیں لیکن قانونی تنقید اور مشوروں کو قطعی نظر انداز نہیں کرتے۔“

”اور پھر۔۔۔؟“

”اور۔۔۔ اور پھر وہ اپنے لوگوں کی بہتری کے لیے ہر ممکن کام کرتے ہیں۔“

”لیکن مظاہرہ کرنے والے امریکی نہیں ہیں ملکہ عالیہ۔“ مسز موریا نے کہا۔ ”زیادہ

تر لوگ تو تمہارے سابق وطن بھارت اور تمہاری موجودہ رعایا ہیں۔“

”مگر میرے شوہر قاتل نہیں۔“ شیتل ہنسیر یاکی انداز میں چلائی تھی۔

”آپ امور مملکت کو نہیں سمجھتیں ملکہ، آئیے میرے ساتھ کمرے میں چلیں۔“ مسز

موریا، شیتل کو نرمی سے ہٹالے گئیں اور پھر اس بوڑھی عورت نے اس پر کچھ ایسا جادو جگایا کہ

واشنگٹن چھوڑنے سے قبل شیتل نے اسے ملازمت کی پیش کش کر دی۔ بحریہ جیسے مملکت میں

رہائش اختیار کرنے سے خوفزدہ مسز موریا نے پیرس میں بولیوارڈ میورس پیرز پر واقع ٹاؤن

ہاؤس میں ہاؤس کیپر کی حیثیت سے ملازمت قبول کر لی۔ اُس کے علاوہ پورے ٹاؤن ہاؤس

کا تمام اسٹاف فرانسیسی تھا۔ لیکن ان کی زبان نہ جاننے کے باوجود اس نے ہاؤس کا بہترین

انتظام کر رکھا تھا۔

دوسروں کے لیے وہ کچھ بھی تھی۔ لیکن شیتل کے لیے اس کی ذات ایک محفوظ چیز سے کم نہ تھی جو اپنی مالکن اور اس کے بچوں کی بے تحاشا وفادار تھی۔ اس لیے جب کوئی شخص بھی اس کے بارے میں کوئی غلط تبصرہ کرتا، شیتل کو غصہ آ جاتا تھا۔

شاید اس بار بھی وہ فریڈی کو کوئی جواب دیتی یا اسے بُری طرح ڈانٹ دیتی لیکن اسے اریبہ وی آئی پی لاؤنچ سے نکل کر اپنی طرف بھاگتی ہوئی نظر آئی تھی۔ اریبہ آتے ہی اپنی سوتیلی ماں کے گلے میں جھول گئی اور فریڈی اپنی جان بچ جانے پر ہلکا دھڑکا کرنا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

”کیسی ہو جان؟“ شیتل نے رسائیت سے پوچھا۔

”کیا ہم فوری طور پر کہیں چل سکتے ہیں، آنٹی؟“

”ابھی؟ گھر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ شیتل نے کلائی کی طلائی اور ہیرے جڑی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”نہیں، وہاں موریا موجود ہے۔“ اریبہ نے نفی میں جواب دیا۔ ”وہ ہماری باتیں سن

لے گی۔“

”تو پھر تمہارے اپارٹمنٹ پر چلتے ہیں۔“

”نہیں، نہیں وہ اس سے بھی زیادہ غلط جگہ ہے۔“

”اچھا یہاں سے تو چلو۔“ شیتل نے اسے اس کی پہلی ہیکوٹ کی طرف دھکیلتے ہوئے

کہا۔

”ہم وائسری ڈسٹرکٹ چل رہے ہیں۔“ اریبہ نے کار پارکنگ لائٹ سے نکالتے

ہوئے کہا۔ ”وہاں ایک ریسنورنٹ میں آرام سے بات ہو سکتی ہے۔ مالک مجھے جانتا ہے۔“

شیتل خاموش رہی تھی۔ ریسنورنٹ کا مالک واقعی اریبہ کو جانتا تھا۔ اس نے دونوں کے لیے ایک الگ جگہ میز ڈلوادی۔ جب ویٹر آرڈر سرور کر کے چلا گیا تو شیتل اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہاں، اب بولو کیا مسئلہ ہے؟“

”ریکس ہولڈن!“ شیتل کی توقعات کے عین مطابق اریبہ نے اپنے محبوب کی بات ہی شروع کی تھی۔ ”میں آپ کو اس کے بارے میں بتا چکی ہوں آنٹی، ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ آپ کو صدمہ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ آخر آپ نے بھی غیر مذہب ہونے کے باوجود پیا سے شادی کی تھی نا؟۔۔۔ وہ دوسروں سے بہت زیادہ مختلف ہے، آپ اسے پسند کریں گی۔“

”تو پھر تمہیں کیا چیز پریشان کر رہی ہے؟“ شیتل نے بدقت تمام پوچھا۔  
 ”پتا!“ اریبہ نے جواب دیا۔ ”میں پریشان ہوں کہ جب انہیں ریکس کے بارے میں معلوم ہوا تو ان کا رد عمل کیا ہوگا؟ بشرطیکہ ابھی تک انہیں اس کی اصلیت معلوم نہیں ہے تو۔۔۔ وہ کم از کم شوہر کی حیثیت سے میرے لیے ریکس کا انتخاب نہیں کریں گے۔“  
 ”ایزی، بے بی۔“ شیتل نے حیرت سے اپنی سوتیلی بیٹی کو دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہاری آزادی کے باعث وہ تمہارے لیے شوہر منتخب کرنے کی غلطی نہیں کریں گے بلکہ اس کے بجائے وہ کریم کے لیے دلہن ضرور تلاش۔۔۔“  
 ”وہ امریکی ہے۔“ اریبہ نے شیتل کی بات کاٹی۔  
 ”میں بھی تو بھارتی ہوں۔“

”آپ کی بات اور تھی آنٹی۔“ اریبہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ سارہ یون میں اکناکس کا طالب علم ہے لیکن اس کا جرم یہ ہے کہ وہ سیاہ فام ہے۔“  
 ”تمہارے والد کی تمام غلطیاں اپنی جگہ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ متعصب ہرگز نہیں۔“  
 ”یہاں تک تو صحیح ہے۔“ اریبہ نے اپنی سوتیلی ماں سے اتفاق کیا۔ ”ریکس ایک انقلابی ہے اور حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔“

شیتل نے کافی کا گک اٹھا کر اسے ہاتھ میں تھام لیا اور کئی لمحے اسے نکلتی رہی۔ اب اس بات چیت سے وہ جھکنے لگی تھی۔ ”تو کیا ہوا؟“ بالآخر اس نے کہا۔ ”میں نے بہت سے نوجوان انقلابی دیکھے ہیں لیکن امریکہ اب بھی زندہ ہے۔“

”آپ سمجھ نہیں رہیں آنٹی۔“ اریبہ نے خالص سمجھانے والے لہجے میں کہا۔ ”وہ امریکی حکومت کا نہیں بحریتی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ پتا کی خفیہ پولیس اور فوجی

ادارے اس کے تعاقب میں ہیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو، اریبہ۔“ شیتل تقریباً چیخ اٹھی۔ ”کیا وہ تھا ہے یا کسی تنظیم کا رکن ہے؟“

”اس میں کئی قومیتوں کے سینکڑوں طلباء ملوث ہیں۔ وہ عموماً ایک مؤقف پر رضامند نہیں ہوتے، لیکن اس ایک بات پر وہ سب متفق ہیں کہ پٹنا اور ان کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔“

”اور تم جانتی ہو کہ وہ اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ شیتل نے کہا۔  
 ”وہ کوئی دہشت گرد نہیں۔“ اریبہ نے اپنے محبوب کی حمایت کی۔ ”وہ سیاسی دباؤ کے ذریعے حکومت کی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ کیونکہ وہ پٹا کی طاقت سے بخوبی واقف ہے۔“  
 ”تو اس میں تمہاری پریشانی کہاں سے ٹپک پڑی اگر ایسی بات ہے تو ریکس واپس امریکہ چلا جائے۔ تم پہلے ہی اپنے والد سے بغاوت کر چکی ہو۔ تم بھی اس کے ساتھ سدھارو اور خوش خوش زندگی گزارو۔ تمہارے والد۔۔۔“

”مجھے حیرت ہے کہ آپ پٹا کی چیمپی بیوی ہو کر یہ کہہ رہی ہیں۔“ اریبہ نے شیتل کی بات کاٹ دی۔ ”اگر آپ ان کی قوت سے واقف نہیں تو پھر میں یہی کہوں گی کہ آپ نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران آپ لوگوں میں جو خلیج حائل ہے اس کے بارے میں کم از کم میں تو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں اور آپ اب بھی ان کی حمایت میں بیان داغ رہی ہیں۔“

”میرے اور شاہ کے تعلقات اب اتنے خفیہ نہیں رہ گئے کہ میں ان کی وجہ سے بلیک میل ہو جاؤں۔ ان دُوریوں کے باوجود کم از کم میری ذات اور آزادی پر کوئی حرف نہیں آیا۔“

”تو کیا میں سمجھ لوں کہ ریکس بھی آپ کی طرح محفوظ رہے گا؟“ اریبہ نے پوچھا۔  
 ”اس کا انحصار تم دونوں پر ہے۔“ شیتل نے کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”گڑھے تم دونوں کے سامنے ہیں۔ چاہو تو ان میں چھلانگ لگا دو، چاہو تو کتر اگے گزر جاؤ۔“  
 اریبہ نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن شیتل پلٹ کر خارجی دروازے کی طرف بڑھ چکی تھی۔

سالوں کی رفاقت سے شیتل اور ڈاکٹر روز لیزکس کے درمیان پیشہ ورانہ تعلق، دوستی میں بدل چکا تھا اب شیتل جب بھی پیرس آتی ڈاکٹر لیزکس سے ضرور ملتی بلکہ بسا اوقات تو وہ صرف ڈاکٹر سے ملنے ہی پیرس آتی تھی۔

جوبلی سے پہلے موجود ملاقات کے لیے شیتل نے بڑے سرسری سے لہجے میں رامیر سے پیرس میں رک کر کچھ شاپنگ کرنے کا بہانہ بنایا تھا کہ اس میں اریبہ اس کے ہمراہ ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جوبلی تقریبات کے لیے مختلف اقسام کے کم و بیش ساٹھ نئے لباس خریدنا چاہتی ہے۔

”خریداری کے بعد میں لباسوں میں ضروری تبدیلیوں اور فٹنگ کے لیے وہاں رکوں گی۔“ شیتل نے ڈنر پر اپنے شوہر کو آگاہ کیا تھا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جب تک چاہو رکو۔“ رامیر کا جواب شیتل کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔

بعد میں ان دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب دونوں اپنے الگ الگ اپارٹمنٹس میں جانے کے لیے اٹھے تو شاہ نے اس کی راہ روک لی۔

”تم اب بھی ایک خوبصورت عورت ہو شیتل۔“ رامیر نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ”کاش زندگی یوں تباہ نہ ہوئی ہوتی۔“

”میری یا آپ کی؟“ شیتل نے ہولے سے دریافت کیا۔

”دونوں کی۔“

”آپ کو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ ہم نے ایک اچھا وقت گزارا ہے اور اب بھی

ہمارا بہت اچھا خاندان ہے، ہمیں اُس کے لیے ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“

”درست کہتی ہو۔“ رامیر نے اس سے اتفاق کیا۔ ”میں آج بھی کریم کی پیدائش کا

دن نہیں بھولا۔ وہ مستقبل کا اچھا بادشاہ ثابت ہوگا۔ کیا تم پیرس سے واپسی پر اس سے ملاقات کرو گی۔“

”ہاں۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”اس کا انتظام ہو چکا ہے۔ ارون، ریال سے آ کر جینوا میں مجھ سے ملے گا اور پھر ہم دونوں کریم کے انسٹرکٹرز سے ملنے لی روزی جائیں گے۔“

رامیر کا چہرہ تن گیل۔

”مت بھولیں کہ ارون کا انتخاب اس وقت تک کے لیے کیا گیا ہے جب تک کریم کالج میں داخلہ نہیں لے لیتا۔“ شیتل نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”اور وہ ابھی اسکول میں ہی ہے۔“

رامیر نے نظر بھر کر اپنی بیوی کو دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

پیرس سے جینیوا کی پرواز کے دوران فریڈی نے معمول کے مطابق مارٹینی کا پہلا گلاس شیشیل کو پیش کیا تو وہ خاصی مضحل سی تھی۔ پیرس میں اس کے دن بڑے پور گزرے تھے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو محبتوں کا خراج وصول کرنا اور ادا کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن پیرس میں اس خراج کی ادائیگی یا وصولی کے لیے کوئی اس کے ہمراہ نہ تھا۔ ڈاکٹر لیزکس نے بھی اُس کی اس کمزوری کو ڈھونڈ نکالا تھا۔

”تم محبتوں کے معاملے میں اپنا رمل ہو۔“ ڈاکٹر نے فتویٰ دیا تھا۔ ”تم لوگوں کو ان کی اوقات سے بڑھ کر نوازنا چاہتی ہو۔“

”لیکن اردن تو دوسرے مردوں جیسا نہیں۔“ اس کے دل کا چور بول اٹھا۔  
 ”شاید نہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”میں غیب کا علم تو نہیں رکھتی لیکن جب تم خود کو مکمل طور پر بدلوگی پھر پتا چلے گا وہ کس شے کا بنا ہوا ہے؟“

اور اب اردن اور جینیوا سے کچھ ہی دیر کی مسافت پر وہ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ اردن کے بارے میں اس کا اعتماد کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ جلد ہی اردن کا امتحان ہونے والا تھا۔ لیکن سوال یہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی اردن کو اتنا کچھ دے چکی تھی جتنا کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ رہا ہوگا۔ اصل سوال یہ تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں اردن اُس کا ساتھ دے گا؟ مستقبل قریب میں وہ جو فیصلہ کرنے جا رہی تھی کیا اردن اس فیصلے کی روشنی میں اس کی زندگی میں شامل رہے گا یا نہیں؟

سوچنے کا مقام یہ تھا کہ خود شیشیل کو کیا کرنا چاہیے۔ اریبہ نے رامیر کی خفیہ پولیس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کے پیش نظر شیشیل کو اردن کی جان کی فکر پڑ گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ سینٹ موریز میں دونوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بعد رامیر نے اس سے کہا تھا کہ وہ دوست بنانے کے شایق حق کو کبھی اپنی ملکہ کے لیے پسند نہیں کرے گا اور اب اگر اسے



ارون کے ساتھ شیتل کی دوستی --- جس کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ رامیر جانتا ہے --- کا علم ہوا تو وہ اس کے خاتمے کے لیے کیا اقدامات کرے گا۔ ممکن تھا کہ جب رامیر کو اپنی بیوی کے مستقبل کے منصوبوں کی بھٹک پڑتی تو وہ ارون کے قتل کے احکامات صادر کر دیتا۔

شیتل نے گھبرا کر اپنا کوٹ جسم کے گرد کس لیا۔ لیکن یہ حرکت سردی کے باعث نہیں، اضطراب کے باعث تھی۔ اگر اریہ کے خدشات درست تھے تو ارون کو مستقبل کے خطرات سے ہوشیار کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ اس پر زور دیتی کہ وہ بحریت چھوڑ دے۔ بعد میں کسی مناسب وقت پر وہ اس سے دوبارہ مل سکتی تھی۔ بشرطیکہ وہ رامیر کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہ کرے۔۔۔۔

”کریم بہت پریشان ہے یورمبجٹی۔“ ارون کپور نے ڈرائیور کی موجودگی کے باعث نہایت احترام سے شیتل کو مخاطب کیا تھا۔ وہ دونوں سیاہ رنگ کی لیموزین کی کچھلی نشست پر براجمان تھے۔

ارون کپور نے جینیوا ائر پورٹ پر شیتل کا استقبال کیا تھا۔ اور اب دونوں شہزادہ کریم سے ملنے لی روزی جا رہے تھے۔

”کیوں؟“ شیتل نے دریافت کیا۔

”میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔“ ارون نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر وہ پھپھار رہا ہے۔“

شیتل نے جواب دینے سے پہلے بٹن دبا کر اپنے اور ڈرائیور کے درمیان ساؤنڈ پروف شیشہ چڑھا دیا تھا۔

”پریشانی کی وجہ کوئی لڑکی تو نہیں؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم اُس سے بات کر کے دیکھو، تمہیں یقیناً بتا

دے گا۔“ شیشہ چڑھتے ہی ارون کا لہجہ بدل گیا تھا۔

شیتل نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کریم سے پوچھنے کی کوشش ضرور کرے گی۔ وہ بار بار سوچتی رہی کہ ارون کو رامیر کی خفیہ پولیس کے بارے میں آگاہ کرے، لیکن کوئی فیصلہ نہ کر پائی اور اسی شش و پنج میں کریم کا اسکول آ گیا۔

کریم نے گرم جوش سے گلے مل کر اپنی ماں کا استقبال کیا۔ اور پھر اسے کھینچتا ہوا لان کے ایک تنہا گوشے میں لے گیا۔ اُس نے جو راز کی بات شیتل کو بتائی اسے سُن کر وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔

”ایسی باتیں تمہیں کون بتاتا ہے۔“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”جیسپر، جی۔“ کریم نے مسی صورت بنا کر جواب دیا۔ ”وہ امریکی میرا کلاس میٹ ہے۔ گزشتہ ہفتے ہی وہ سویڈن سے آیا ہے۔ اس نے یہ بات اپنے ماں باپ سے سُنی تھی۔“

”کیا؟“

”کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ پتا کی کسی اور عورت سے دوستی ہے۔“ کریم نے اٹکتے ہوئے کہا۔ شیتل نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ”دیکھو کریم؟“ اس نے بیٹے کے رخسار کو بوسہ دیا۔ ”ہماری شادی کو چند سال ہو گئے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مرد کسی دوسری عورت سے دوستی۔۔۔“

”لیکن۔۔۔“

”خاموش رہو۔“ شیتل نے اسے ڈانٹا۔ ”اگر یہ بات درست بھی ہے تب بھی وہ عورت میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جس طرح میں نے اپنی آنکھیں اور کان بند کر رکھے ہیں، تم بھی کر لو۔“

”جی؟“ کریم کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”وہ عورت، پتا لارسن یہاں سوئٹزر لینڈ میں موجود ہے۔ پتا نے اسے لاؤسن میں الگ مکان لے کر دیا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور پتا اور اس عورت کا ایک بیٹا بھی ہے۔۔۔ پتا گزشتہ ہفتے بھی اسی کے ساتھ تھے۔“

”ناممکن۔“ شیتل لرزتی آواز میں بولی۔ ”تمہارے پتا گزشتہ ہفتے برسلز میں تھے۔ کیا تم نے اخباروں میں ان کی خبریں اور تصویریں نہیں دیکھیں؟“

”میں جانتا ہوں جی، پتا گزشتہ ہفتے برسلز میں تھے۔ اس سے پہلے لندن اور بون اور اس سے بھی پہلے روم میں تھے۔ لیکن ہر بار وہ سوئٹزر لینڈ بھی رکے تھے۔ اپنے بیٹے اور دوسری بیوی سے ملنے۔۔۔“

شیتل نے کریم کو تو جیسے تیے مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن خود وہ طوفان میں گھری کشمی کی طرح واپس آئی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی گر پڑے گی۔ ارون نے بڑھ کر اسے سہارا دینا چاہا لیکن وہ اسے جھک کر عقبی سیٹ پر گر گئی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ارون کو سب احوال کہہ سنایا تھا۔

”تم غلطی کر رہی ہو جان۔“ ارون نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”جو کچھ کریم نے

سنا، وہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ شیتل نے زور دے کر کہا۔ ”را میر کی دوستیوں کی کہانیاں میں پہلے بھی سن چکی ہوں لیکن اس بار صورت حال مختلف ہے۔ اس نے اس عورت کے لیے الگ گھر لیا ہے۔۔۔ دونوں کا ایک بچہ بھی ہے مجھے یہ کوئی اخلاقی اور جذباتی بندھن لگتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو بلکہ۔۔۔“

”ایسا ہی ہے، میں اس کا پتا چلاؤں گی۔“ شیتل نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”اگر را میر دُنیا میں کسی عورت سے پیار کر سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں، اگر دُنیا میں اس کا کوئی بچہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف میرا ہوگا۔“

”مگر تم تو اس سے پیار نہیں کرتیں۔“

”کرتی تھی۔۔۔ بہت زیادہ کرتی تھی۔۔۔ میں نے اُس کے ہوتے ہوئے کسی اور کا تھوڑا بھی نہیں کیا تھا۔ میرے اعتماد کو پہلے اس نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ زخمی کرنے میں اُس نے پہل کی تھی اور تم جانتے ہو نا کہ زخمی عورت، ناگن سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔“

شیتل نے ڈرائیو کو دہ پتا بتا دیا تھا، جو کریم نے اسے دیا تھا۔ جونہی کار اس کے مطلوبہ مکان کے سامنے رکی وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

”میں بھی تمہارے ساتھ آ رہا ہوں۔“

”یہ تمہارا نہیں، میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنی ذات کے مسائل خود حل کرنا پسند کرتی

ہوں۔“

سادے سے انداز میں سجے ہوئے کمرے میں وہ تنہا تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ملازمہ جس نے اسے اندر آنے کی دعوت دی تھی کئی منٹ پہلے گھر کے کیمنوں کو خبر دینے اندر چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے دریافت کیا تھا۔

”کیا بتاؤں کہ کون ملنے آیا ہے؟“

”شیتلا کملاوتی موہن۔“

ملازمہ کے جانے کے بعد شیتل نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ انتہائی سادہ چیزیں اور سادہ آرائش تھی۔ وہ کسی طور بھی کسی بادشاہ کی رہائش گاہ کا حصہ نہیں لگتا تھا۔ شیتل اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی، دعائیں مانگتی رہی کہ کریم کی بات غلط ہو۔ وہ اطمینان کے قریب تھی کہ اس کی نگاہ کارنس پر رکھی ایک تصویر پر ٹک گئی اور اس پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ رامیر ایک بچے کے ہمراہ قہقہہ لگا رہا تھا۔ شیتل کی نظروں کے سامنے ڈھند چھا گئی۔ شاید وہ رو دیتی لیکن ایک نسوانی آواز نے اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔

”مسز کملاوتی؟“ آواز عقب سے آئی تھی۔ شیتل نے کرسی کا سہارا لے کر مڑنے کی

کوشش کی۔

”یور میجسٹی!“ اس عورت کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ شیتل نے ایک طویل قامت سفید فام عورت کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔ ”اوہ مائی گاڈ! پلیز۔۔۔ یور میجسٹی۔۔۔ ملازمہ نے مجھے نہیں۔۔۔ بتایا تھا۔۔۔“ جیلے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ اور شیتل بڑے غور سے پیتا لارسن نامی اس عورت کو دیکھ رہی تھی جس نے اس کے حقوق پر پہلا باضابطہ ڈاکا ڈالا تھا۔

”ہماری خواہش تھی کہ آپ کبھی ہمارے بارے میں نہ جان سکیں۔“ بالا خرچہ پیتا لارسن

نے اپنی حالت پر قابو پا کر کہا۔

”لیکن میں دوسروں کے بارے میں ضرور جاننا چاہتی ہوں۔“ شیتل نے روکھے پن سے جواب دیا۔ ”تم کون ہو؟“

”کوئی خاص شے نہیں۔“ پیتالارن کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ ”میں خوبصورت ہوں نہ جوان۔ آپ کو یہاں شاہی دبدبے اور دولت کی ایک جھلک بھی نظر نہ آئے گی۔ میں اور ایرک ایک تنہا اور بے سکون زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی لیے جب انہوں نے مجھے آپ اور دوسری دوستوں کے بارے میں بتایا تو کوئی دکھ نہ ہوا۔“

”ایرک؟“ شیتل کی ڈوبتی آواز ابھری۔

”ہمارا بیٹا، وہ اس وقت سو رہا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ اس سے نہ ملیں۔“

پیتالارن نے عجیب سے انداز سے کہا۔ ”میں پیشہ وراکنا مسٹ ہوں، شاہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے اسٹاک ہالم آئے تھے۔ مجھے ان کی رابطہ آفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ آپ اُن دنوں افریقہ کے جنوبی علاقے کے دورے پر تھیں لیکن وہ آپ کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتے تھے۔۔۔ مگر آپ کو ہمارے بارے میں بتایا کس نے؟“

”میرے بیٹے نے۔“ شیتل نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ فسانے اُس کے ہم جماعتوں کی زبان پر ہیں، مجھے بتاؤ کہ۔۔۔“

”میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ پیتالارن نے حتمی انداز میں کہا۔ ”انہیں خبر ہوئی تو وہ بے حد ناراض ہوں گے اور میں اور ایرک ان کی ناراضی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“

”تب پھر میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گی۔“ شیتل نے جھکے کے ساتھ کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات یاد رکھنا پیتا! میری یہاں آمد کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے کسی کو۔ میں اپنے بیٹے کو سمجھا دوں گی کہ اس نے جو کچھ سنا وہ محض ایک جھوٹ تھا۔ میں خود کیا کرنا چاہتی ہوں یہ آنے والا وقت بتائے گا۔“

پیتالارن اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے جھکے سے دروازہ کھولا اور کھٹ کھٹ کرتی کار کی جانب چل دی۔ ارون اس کا منتظر تھا۔

”مجھے پتا کو دیکھ کر بے حد افسوس ہوا ہے۔“ شیتل نے ارون کو بتایا۔ دونوں اس وقت ریال واپسی کے لیے جہاز پر سوار تھے۔ اور کھانا دونوں کے درمیان میز پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ محبوب پہلے سے شادی شدہ اور مفرد باپ ہو، وہ ایک اچھی خاتون ہے، لیکن اس کے ساتھ سلوک بہت بُرا ہو رہا ہے۔“

”تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”پتا اور ہر میچٹی ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”کم از کم میں قیدی تو نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے کسی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کیوں اور کیسے اور مجھے اسی کا پتا چلانا ہے۔“

”کیا تم نے کوئی خاص پروگرام ترتیب دیا ہے؟“ ارون نے دریافت کیا۔

”ہاں، لیکن میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پتا کاراز آشکار ہونے سے حکمت عملی ذرا تبدیل ہوگی اور اب میں رامیر کو تکلیف پہنچاؤں گی۔ اسے پریشان کروں گی۔ اُسے۔۔۔“

”شش۔۔۔“ ارون نے اسے خاموش کر دیا۔ ”فریڈی تمہارے عقب میں موجود ہے۔ ہم رات کو تنہائی میں اس پر بات کریں گے۔“

رات کو انہیں تنہائی ضرور ملی لیکن دونوں میں سے کسی نے منصوبے پر کوئی بات نہیں کی۔

فاروق مُردوں کی طرح بستر پر پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور سلمیٰ قاہرہ کے شیرشن ہوٹل کی کھڑکیوں سے شہر کا نظارہ کر رہی تھی۔

وہ بمبئی سے ریال جاتے ہوئے قاہرہ میں رُکی تھی۔ اس پروگرام کا پہلے سے کوئی شیڈول نہیں تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اور فاروق گزشتہ دو ماہ سے ایک دوسرے سے دُور تھے، اس کی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ اسے ڈسٹرب کرے۔ ان دونوں کے درمیان یہ معاہدہ موجود تھا کہ فاروق جب بھی کسی لوکیشن پر ہوگا، وہ اسے پریشان نہیں کرے گی۔

فاروق دو ماہ سے قاہرہ میں ”خودسر“ نامی فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا جو آکاش اسٹوڈیوز اور ایک مصری فلم ساز کی مشترکہ پروڈکشن تھی۔ شروع میں تو فلم ٹھیک ٹھاک رہی لیکن بعد میں اطلاعات ملنی شروع ہوئیں کہ فاروق فلم کے نام پر گُل چھرے اڑا رہا ہے اور آکاش اسٹوڈیوز کا پیسہ اس مصری حسینہ پر لٹا رہا ہے جو ”خودسر“ کی ہیروئن تھی۔

اسٹوڈیوز کے مالکان نے سلمیٰ فاروق کو ہدایت کی تھی کہ وہ ریال جاتے ہوئے کچھ دن قاہرہ میں رک کر اپنے شوہر کے کام کا جائزہ لے اور انہیں مکمل رپورٹ فراہم کرے کہ کیوں نہ اس فضول خرچی کی پاداش میں اسے فلم سے الگ کر دیا جائے۔

سلمیٰ نے گزشتہ تین دنوں میں مختلف لوکیشنز پر جا کر اپنے شوہر کی سرگرمیوں کا بغور جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مالکان کی اطلاع غلط نہیں۔ فاروق واقعی ان کی دولت بے دردی سے لُٹا رہا تھا۔ جب اس نے فاروق سے اس مسئلے پر بات کی تو اس نے اسے غلط رنگ میں لیا تھا۔

”مجھے اپنی بیوی کے مُنہ سے یہ سب سن کر حیرت ہوئی ہے۔“ گزشتہ شب اس نے سلمیٰ کے الزامات کے جواب میں کہا تھا۔

”فاروق۔“ سلمیٰ نے اس کے لہجے پر حیرت کا اظہار کیا ”میں تمہاری بیوی ہوں، لیکن



آکاش اسٹوڈیوز کی چیف ایگزیکٹو بھی ہوں اور تم جانتے ہو کہ یہ فلم آکاش اسٹوڈیوز کے بینر تلے بن رہی ہے۔ اس لیے میں مجاز ہوں کہ۔۔۔“

”تمہیں تو میری طرف سے لڑنا چاہیے۔“ فاروق نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”پیسے کے ان خداؤں کو سمجھاؤ کہ میں فن کار ہوں، گوشت پوست کا اور یہ فلم انڈسٹری ہے۔ بھوتوں کا کاروبار یا اشاک مارکیٹ نہیں۔“

”میں ہمیشہ تمہارے حقوق کے لیے لڑی ہوں۔“ سلٹی نے جواب دیا۔ ”اب بھی لڑ رہی ہوں اور آئندہ بھی لڑوں گی لیکن خدا کے لیے خود کو سنبھالو۔“

”میں تھک گیا ہوں ڈارلنگ۔“ فاروق نے ایک بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ایک ہفتے کے لیے پروڈکشن بند کر کے تمہارے ساتھ ریال چلوں۔ آرام کے بعد واپس آؤں گا تو مجھ میں نئی توانائیاں ہوں گی اور پھر میں بہتر انداز میں کام کر سکوں گا۔ اور تم جب واپس اسٹوڈیوز جاؤ تو اپنے ناخداؤں کو بتا دینا کہ میں کوئی عام آدمی نہیں جسے اتنی آسانی سے تبدیل کر دیا جائے۔“

سلٹی فوری پر خاموش ہو گئی تھی۔

”جو کچھ میں نے کہا ہے شاید تم اسے سمجھ نہیں سکے۔“ اُس نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ ”ہم خود سر کے اخراجات کم کرنے کی بات کر رہے ہیں، کسی سمرکیمپ پر جانے کی نہیں۔“

”تو پھر تم فیصلہ کر لو کہ کس کا ساتھ دو گی؟“

”تمہارا اور کس کا؟“ سلٹی چیخ اٹھی تھی۔ ”آخر میں تمہاری بیوی ہوں۔“

”تو پھر اپنے آقاؤں کو بتا دو کہ تم میرے کام سے مطمئن ہو، انہیں یقین دلاؤ کہ خود سر بھارتی فلم انڈسٹری میں نئے ریکارڈ قائم کرے گی۔“

”فاروق! کیا کہہ رہے ہو تم؟“ سلٹی نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”مم۔۔۔ میں

۔۔۔ اتنا بڑا جھوٹ کس طرح بول سکتی ہوں؟“

”نہیں بول سکتیں تو جہنم میں جاؤ۔“ فاروق نے چڑ کر کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا

تھا۔

اب سلمیٰ جانے کو تیار تھی لیکن جہنم میں نہیں، ریال جانے کے لیے۔ شہر کا نظارہ کرتے ہوئے اس نے نیچے پارکنگ لائٹ میں دیکھا۔ پورٹر ہوٹل کی گاڑی میں اُس کا سامان رکھ رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ سلمیٰ نے سوئے ہوئے فاروق پر الوداعی نگاہ ڈالی اور اپنا پرس اٹھا کر خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ایک گھنٹے بعد کویت ائرویز کا طیارہ دوسرے مسافروں کے ساتھ آکاش اسٹوڈیوز کی پروڈکشن ہیڈ سلمیٰ فاروق کو لے کر ریال پرواز کر چکا تھا۔ جہاں وہ اپنی بہترین سہیلی ملکہ بحریت شیتل رامیر سے ملنے جا رہی تھی۔

سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ فلائٹ میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا تھا۔ لیکن وجیتا کا میک آپ تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ یوں بن ٹھن کر نکلا کرتی تھی جیسے ابھی سولہویں سال میں قدم رکھا ہو۔

”وجیتا۔“ سوہن ٹککرنی نے کوئی دسویں مرتبہ اسے پکارا۔ ”اب آ بھی چکو، جسہیں علم ہے کہ ہم نے فادرلین کو بھی گر جے سے پک کرنا ہے۔ فلائٹ اگر مس ہو گئی تو پھر تین روز مزید انتظار کرنا پڑے گا۔“

”آ رہی ہوں۔“ وجیتا نے جواب دیا اور بالوں میں کلپ لگاتی باہر نکل آئی۔ ”کیوں بلا وجہ شور مچا رکھا ہے۔“

سوہن نے جلدی جلدی نوکر کو ضروری ہدایات دیں اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ وجیتا کو اس نے دوسری سمت سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

یہ شیتل کی خواہش تھی کہ وجیتا اور سوہن ٹککرنی، فادرلین کو اپنے ہمراہ ریال لے کر آئیں۔ وجیتا بہت سی وجوہات کے باعث فادرلین کو ناپسند کرنے لگی تھی لیکن شیتل نے حالیہ خط میں انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ تینوں اکٹھے سفر کریں۔

فادرلین، روانگی سے ایک روز قبل سری نگر سے دہلی آ گئے تھے۔ اور پارٹنر ہاؤس نامی یتیم خانے میں مقیم تھے جو ایک مقامی گر جے کے زیر انتظام چل رہا تھا۔

فادرلین انہیں تیار ملے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وجیتا ٹککرنی، اراٹھیا کے طیارے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے پیچھے رہنے کا ہرگز تکلف نہیں کیا تھا جو 65 سالہ فادرلین کو سہارا دے کر اوپر لا رہا تھا۔

ہوٹل تاج محل کے جگمگاتے ڈائننگ ہال میں جھللاتے لباسوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ فلم انڈسٹری کے تمام بڑے نام اور معروف چہرے وہاں جمع تھے۔ تقریب، آدی نارائن کالنج تھا جو اُس نے ماضی کے سپر اسٹار اٹیل کمار کے اعزاز میں دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ میزبان آدی نارائن تھا، اٹیل پہلے ہی آکر ایک کارزنمیل سنبھال چکا تھا چنانچہ خود آدی جب ہال میں داخل ہوا تو اٹیل نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

”کیسے ہو، اولڈ بوائے؟“ آدی نارائن نے خوش دلی سے ہاتھ ملایا۔  
 ”اولڈ بوائے؟“ اٹیل نے جواب میں قہقہہ لگایا۔ ”ویسے یہ بھی شکر ہے کہ تم نے مجھے لڑکوں کی فہرست میں تو شامل رکھا۔“

”دنیا جانتی ہے اٹیل۔“ آدی نارائن نے اس کا ساتھ دیا ”تم اب بھی کسی جوان سے کم نہیں۔ اسی لیے تو ملکہ نے تمہیں بھی دعوت دی ہے۔“  
 ”فکر نہ کرو میں لڑائی کے لیے تیار ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ آدی نارائن نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”چھوڑو یار، کیوں بے وقوف بناتے ہو؟“ اٹیل نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہم دونوں ہی شیتل سے کچھ نہ کچھ چاہتے ہیں لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ ہم اس کی کیا ضرورت پوری کر سکتے ہیں؟“  
 ”تم نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ ہم سے کچھ چاہتی ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس نے ہمیں شکلیں دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔“ اٹیل نے جواب دیا۔ ”پندرہ سال بعد اس نے ہمیں فرسٹ کلاس کے کنٹ محض اس لیے بھجوائے ہیں کہ انڈیا اور بحریت اروز کے بزنس میں اضافہ ہو سکے؟ نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔ میں نے اُن کے شاہانہ جاہ و جلال میں بہت سی دراڑوں کی خبریں سنی ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسی ہی

”وہ جو کچھ مانگے گی میں اُسے دینے کو تیار ہوں۔“

”تم نے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہیں۔“ آدی نارائن نے اسے چڑایا۔  
 ”لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔“ انیل کمار نے جام اٹھاتے ہوئے کہا۔  
 ”ریال کے نام! تم بے شک کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھے رہنا لیکن جہاز سے اترنے والا میں پہلا  
 مسافر ہوں گا۔“

نیویارک کے ہوٹل بروز ویلٹ کے بارہویں فلور کا کوریڈور خالی پڑا تھا۔ ایلویٹر کا دروازہ کھلا اور تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک باوقار شخص باہر آ کر کمرہ نمبر 1215 کی بڑھا جو آخری سرے پر واقع تھا۔

دروازے کے سامنے رُک کر آنے والے نے گھڑی دیکھی۔ سہ پہر کے ٹھیک تین بجے تھے۔ اس نے دستک دی اور چند ثانیوں میں ہی دروازہ کھل گیا۔

”آؤ میرے دوست، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ دروازے پر نمودار ہونے والے شخص جو ڈاکٹر گوتم نیلامبر کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری حیثیت کے آدمی کو دروازے پر کھڑے ہو کر انتظار کی زحمت اٹھاتے زیب نہیں دیتا۔“

آنے والا درما چند تھا۔ جسے دنیا بھارت کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے جانتی تھی۔ وہ جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے ان دنوں نیویارک میں تھا۔ کل رات ہی اسے نئی دہلی سے بھارتی وزیراعظم کا ایک فون موصول ہوا تھا جس میں اسے وزیراعظم کا خصوصی پیغام لے کر ڈاکٹر گوتم نیلامبر کے پاس جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ڈاکٹر گوتم اقوام متحدہ کی سائنٹفک کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک آیا ہوا تھا اور ہوٹل بروز ویلٹ کے کمرہ نمبر 1215 میں مقیم تھا۔ بھارتی وزیراعظم نے ملاقات کو خفیہ ترین رکھنے کی ہدایت بھی کی تھی۔

”کیا پیو گے، دوست؟“ گوتم نے درما چند کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”کچھ نہیں، پیارے میں تمہارا تھوڑا سا وقت لوں گا۔“ درما چند نے صوفے میں دھستے ہوئے جواب دیا۔

گوتم اس کے پاس بیٹھنے کے بجائے ملحقہ بیڈروم میں گھس گیا۔ درما چند کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا لیکن پھر وہ بولے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

”گوتم!“ اُس نے بلند آواز میں اُسے پکارا۔ ”اگر تم چند منٹ مجھے دے دو تو بھارتی صدر، وزیراعظم، ان کی کابینہ، پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اور پوری بھارتی قوم تمہاری ممنون ہوگی۔ میں ایک اہم موضوع پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ایک منٹ ٹھہرو، درما۔“ گوتم نے وہیں سے آواز لگائی۔ ”مجھے پیرس سے گیتا کو پک کرنا ہے۔ اس کی کوئی چیز یہیں رہ گئی تو وہ مجھے کچا چبا جائے گی۔“

ظاہر ہے، درما کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی شکر ہوا کہ وہ چند ہی منٹ میں باہر نکل آیا تھا۔

”ہاں اب بولو کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے درما چند کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم جانتے ہو کہ شاہ رامیر نے بھارت سے نئے فوجی ہتھیار فراہم کرنے کو کہا ہے۔“ درما چند نے کسی تنہید کا تکلف نہیں کیا تھا۔ ”امریکہ اور روس کو تو اس نے جوتے کی نوک پر رکھا ہوا ہے۔ اب اس کا سہارا ہم ہی ہیں، جن سے وہ اسلحہ خریدتا ہے اور ہم بھی اسے صرف پندرہ فیصد اسلحہ اپنے ملک کا ساختہ دیتے ہیں۔ باقی سارا امریکی اور روسی اسلحہ ہی فراہم کیا جاتا ہے۔ اب شاہ نے شور مچانا شروع کر دیا ہے کہ اسے اپنے بعض پڑوسی ممالک سے خطرہ ہے حالانکہ اصل خطرہ اس کی اپنی سرحدوں کے اندر پل رہا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس دنیا کے مہلک ترین ہتھیار موجود ہیں لیکن وہ روز بروز ہتھیاروں کے معاملے میں لالچی ہوتا جا رہا ہے۔“

گوتم نے دو تین بار اثبات میں سر ہلایا لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

”۔۔۔ پہلے تو ہم اس کے مطالبے بلا جیل و جنت پورے کرتے رہے ہیں، لیکن اب صورت حال ذرا مختلف ہے۔۔۔۔۔“ درما چند نے اپنی بات جاری رکھی ”بھارت اندرونی طور پر خانہ جنگی کا شکار ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک صورت حال بھارت کی مغربی سرحدوں پر رونما ہو رہی ہے۔ پڑوسی ملک نے روس کی دھمکیوں کو بنیاد بنا کر امریکہ سے بے تحاشا اسلحہ خریدا ہے۔ اور وہ بحیرہ عرب کے ساتھ ساتھ فلج کے علاقے میں ایک طاقت ور

حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بھارت اس صورت حال میں خاموش تماشا بنی نہیں رہ سکتا۔ دوسری جانب ہماری نوجوان پود ہے۔ انتخابات سر پر ہیں اگر ہم بحریہ کو اسلحہ فراہم کر دیتے ہیں تو وہ یقینی طور پر اسے ہمارے خلاف انتخابی اسٹنٹ کے طور پر استعمال کرے گی۔ حزب اختلاف کی ساری جماعتیں اس مخالفت میں نوجوانوں کا ساتھ ہی نہیں دیں گی بلکہ رہنمائی بھی کریں گی۔ اور ہم اس مخالفت کا خطرہ مول نہیں لے سکتے، کیونکہ آخر وہ بھی انسان ہیں۔“

”اگر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔“ ڈاکٹر گوتم نے ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

ورما چند نے اس کی مسکراہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

”پندرہ سال پہلے شاہ نے بھارتی ہیر وٹن سے شادی کر کے بے شک ہمارے عوام کے دل جیت لیے تھے۔ اُس وقت اسلحے کی فروخت کا جواز بھی شیتل کلکرنی بن گئی تھی۔ لیکن اب لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم ایک ڈیکلٹر کی مدد کر کے جواب میں کیا حاصل کر رہے ہیں۔“

”وہ کیا لینا پسند کرتے ہیں؟“ گوتم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بھارت خلیج کے علاقے میں پولیس مین کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس علاقے میں اپنے قدم مضبوط کریں۔ ہمارے پاس صرف ایک طیارہ بردار جہاز ہے جس سے اتنے بڑے سمندر کی نگرانی ممکن نہیں۔ لیکن اگر بحریہ کے ساحلوں پر بھارت کو کوئی فوجی اڈہ مل جائے تو ہمارا مقصد حل ہو جائے گا۔“

”اوہ۔“ گوتم نے حیرت سے کہا۔ ”بھارت اس قابل ہو گیا کہ دوسروں کی سرزمین پر اڈے قائم کر سکے۔ اپنے ملک سے تو خانہ جنگی اور علیحدگی پسند تحریکوں کا خاتمہ نہیں کر سکے اور چلے ہو بحریہ پر ترنگا لہرانے۔“

”غلط سمجھے۔“ ورما چند نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا ”میں بحریہ میں بھارتی فوجی اڈے کی بات کر رہا ہوں جہاں بھارتی فوجی اور بھارتی آلات، بھارتی کنٹرول میں کام کریں اس طرح ہم اپنے لوگوں کو بھی مطمئن کر لیں گے۔“

”تو اس سلسلے میں ہمیں کیا کر سکتا ہوں؟“ گوتم نے نکھائی سے کہا۔ ”کیا ریمیر اور اس کے مشیروں کو کہوں کہ بحریہ کے ایک کلٹرے کے حقوق تمہارے نام منتقل کر دیں؟“

”بات کو مذاق میں مت اڑاؤ، گوتم۔“



”تم سب لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“ گوتم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ”تم لوگوں کو قوم کا اتنا ہی درد ہے تو ملک سے غربت ختم کرو، خانہ جنگی ختم کرو، علیحدگی پسندوں کے ساتھ مل کر کوئی درمیانی راہ تلاش کرو، اپنے بچے ہوئے گریبان کو سینے کے بجائے دوسروں کے گریبان مت کھولو۔ تمہارے اپنے گھر میں کھانے کو اناج نہیں اور چلے ہو دوسرے ملکوں کی سرزمین پر بھارتی فوجی اڈے قائم کرنے۔۔۔ تم اور تمہارے اعلیٰ افسران احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔“

”پلیز، گوتم!“ وراچند باقاعدہ التجاؤں پر اتر آیا۔ ”اگر تم ناکام ہو گئے یا میری مدد سے منکر رہے تو میرا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا اور اس مرحلے پر اگر میرا سیاسی بُت ٹوٹا تو ذاتی طور پر میں ایسے بحران کا شکار ہو جاؤں گا کہ مجھے سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔“

”تو یوں کہو، تم اپنا سر بچانے کے لیے، دوسرے کا سر پکھلنا چاہتے ہو۔“ گوتم نے طنزاً کہا۔

”جو بھی سمجھ لو، گوتم۔“ وراچند نے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”صورت حال میں نے تمہیں بتادی اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

بحریت کی حدود میں ملکہ کی نگرانی پر حتمین دوسادہ لباس آفیسر زاپنے شاہی چارج سے چند قدم دور ٹہل رہے تھے۔ احمد نامی آفیسر کی داڑھی تھی جب کہ موٹی کلین شیو تھا۔

ریال ائزپورٹ کی رصد گاہ کے بڑے بڑے شیشوں سے ان کی نگاہیں ٹکرا کر واپس ملکہ پر آنکھیں تھیں۔ وہ ارد گرد کے ماحول پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے۔ ملکہ کی پشت ان کی جانب تھی۔ جب کہ ملکہ خود رصد گاہ کے شیشوں سے منہ لگائے ائزفیلڈ کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے خود کو چھپانے کی ہلکی سی کوشش کے طور پر کالے شیشوں کا چشمہ پہن رکھا تھا۔ اور اپنے سنہرے بالوں پر ریڈیو اسکارف باندھا ہوا تھا۔

عموماً اُس کے محافظ اس سے ٹالیں ہی رہتے تھے۔ وہ حفاظتی انتظامات کو اتنی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اب بھی انہیں یقین تھا کہ جونہی ملکہ کی متعلقہ فلائٹ کا اعلان ہوگا وہ فوراً ٹارک کی طرف بھاگے گی۔

آج کا دن احمد اور مونی کے لیے تھکا دینے والا تھا۔ صبح کے وقت بھی وہ ملکہ کے ہمراہ ائزپورٹ آئے تھے۔ ملکہ کو قاہرہ سے کویت ائرویز کے ذریعے آنے والے اپنے کسی مہمان کا استقبال کرنا تھا۔ جونہی کویت ائرویز کی فلائٹ کا اعلان ہوا۔ ملکہ غائب ہو گئی۔ اُس کے اوجھل ہونے سے ہر اسٹاٹ ہو کر شاہی محافظ جب بھاگتے ہوئے ٹارک پر پہنچے تو وہ گوشت کے ایک پہاڑ سے گلے مل رہی تھی، جسے وہ سلٹی کہہ کر پکار رہی تھی۔ بعد میں ملکہ نے شاہی محل میں احمد اور مونی کو آگاہ کیا کہ مس سلٹی اپنی تھکن دور کرنے کے لیے آرام کریں گی۔

”اور یہ بھی یاد رکھنا۔“ ملکہ نے احمد کو بتایا تھا۔ ”دو گھنٹے بعد ہمیں نئی دہلی سے آنے والی

ائرنڈیا کی فلائٹ کے لیے پھر ائزپورٹ جانا ہے۔“

جونہی لاؤڈ اسپیکر سے اڑاڑیا کی فلائٹ نمبر 203 کا اعلان ہوا شیتل تیزی سے  
 ٹارک کی طرف بڑھی۔ دونوں محافظوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔  
 مسافر ایک ایک کر کے جہاز سے اتر رہے تھے۔ ہر شخص دروازے سے نکل کر ایک  
 لمبے کے لیے بیڑھیوں پر ٹھکتا اور پھر اپنے استقبال کے لیے آنے والوں کی طرف بڑھ جاتا۔  
 شیتل خود بھی جہاز سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہر اترنے والے کا جائزہ لے رہی تھی۔  
 اور پھر اس کے مطلوبہ افراد اسے نظر آ گئے۔ سب سے پہلے موہن گلکرنی جہاز سے باہر  
 آیا۔ وہ پہلے سے مونا ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وجیتا تھی جس نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس  
 سنبھال رکھا تھا۔ دونوں کے عقب میں فادر فلین تھے۔ پادری کچھ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔  
 شیتل نے فادر کو سیڑھیاں اترتے ہوئے دو تین بار رک کر سانس لیتے دیکھا۔  
 سب سے پہلے شیتل، سوہن کے گلے لگی پھر اس نے وجیتا اور فادر کو گلے لگا کر پیار  
 کیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ مختصر سا قافلہ محل کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

وقت ایک کتیا کی مانند تھا۔

شیتل ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی غور کر رہی تھی۔ کہ اس کتیا نے کس طرح اس سے بے وفائی کی تھی۔ خوبصورتی کی پرچھائیاں اب بھی چہرے پر سایہ فگن تھیں۔ اور شیتل کو یقین تھا کہ اسی سال کی ہونے کے باوجود بھی وہ خوبصورت رہے گی لیکن وقت اپنے گزرنے کے نشان چھوڑے جارہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سے حلقے پڑنے لگے تھے۔ گالوں کے گڑھے کچھ زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ ناک کا گوشت بھی کچھ ڈھلک گیا تھا۔ بالوں میں چاندی کا ایک آدھ تار بھی جھلملانے لگا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اب بھی خوبصورت تھی۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے ایک برطانوی میگزین نے ایک مقابلہ حسن میں اسے دنیا کی دوسری خوبصورت ترین خاتون قرار دیا تھا۔ وفادار انگریزوں نے پہلا ایوارڈ اپنی ملکہ ایلزبتھ کو دیا تھا جسے شاید خود بھی یہ احساس ہو گا کہ ایسا نہیں ہے۔

لیکن وقت اپنے اثرات صرف عورتوں پر ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ مرد بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہیں تھے۔ اس نے کئی فلمی رسالوں میں آدی نارائن اور انیل کمار کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ وقت نے انہیں بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ ابھی حال ہی میں کینز فلم فیسٹیول کی ایک تصویر شیتل کی نظروں سے گزری تھی۔ جس میں انیل کی تھوڑی سی توند نکلی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں اپنے فیصلے کو سراہا کہ آدی نارائن اور انیل کمار کے استقبال کو وہ خود نہیں گئی بلکہ اس نے اپنا نامزدہ بھیجا تھا۔ اس نے ان سے فوری ملاقات بھی ملتی کر دی تھی۔ اس نے ہدایات جاری کی تھیں کہ ان کی آمد پر اُسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

”انہیں کہنا کہ میں کل ان سے ملاقات کروں گی۔“ اُس نے اپنے سیکرٹری سے کہا

تھا۔

وہ جانتی تھی کہ آدی نارائن اور انیل کمار کو اس کا نہ آنا یقیناً ناگوار گزرا ہوگا لیکن وہ ملکہ  
تھی اور ملکہ سے اس قسم کا سلوک کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔

oo

”تم اس کی غیر حاضری پر کیا محسوس کر رہے ہو؟“ انیل کمار نے آدی نارائن سے کہا تھا۔ ”مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہم بس اسٹاپ پر کھڑے کوئی مزدور ہوں۔“

”بھول جاؤ انیل، تم فرسٹ کلاس پنجر ہوں جس کا کرایہ شیتل نے دیا ہے۔ باہر ایک رولز رائس، باوردی ڈرائیور کے ساتھ موجود ہے۔ رہائش کے لیے محل کا ایک شاندار حصہ ہوگا پھر بھی تم خود کو مزدور سمجھ رہے ہو؟“

”اس نے جان بوجھ کر ہماری عزتی کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”تم بالکل بچوں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔“ آدی نارائن نے جواب دیا۔ ”وہ ایک ملکہ ہے اور ہماری حیثیت مٹر کے دانوں سے زیادہ نہیں۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت تک اداکارانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائے رکھو جب تک ہم واپس بمبئی نہیں پہنچ جاتے۔“

رولز رائس میں بھی انیل کمار منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ جب کہ آدی نارائن باہر سے گزرنے والے مناظر کا جائزہ لیتا رہا۔

”پچاس برس پہلے یہاں ریت اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا“ شیتل کے بھیجے ہوئے ”وزیر مہمانداری“ کرٹل بدرنوری نے آدی نارائن کو بتایا۔ ”موجودہ شاہ اور ان کے والد نے صحرا کو گلہ سستہ بنا دیا ہے۔“

آدی نارائن نے تو مسکرا کر حقیقت قبول کر لی لیکن انیل کمار نے جو ہنکارا بھرا وہ کسی طور بھی خیر سگالی کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔

”ملکہ شیتل نے بھی ہماری ضروریات اپنے دل سے پوری کی ہیں۔“ کرٹل نور نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ ”جب سے وہ دہن بن کر یہاں آئی ہیں اس وقت سے بحریہ کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کر رہی ہیں۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں اتنی پیاری ملکہ ملی ہیں۔ کیا آپ ملکہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”شاہ سے ملنے سے قبل ہم دونوں اچھے دوست تھے۔“ آدی نارائن نے کرل کو بتایا  
 ”لیکن شادی کے بعد ہم لوگ کبھی نہیں ملے۔ اُس وقت وہ بے حد خوبصورت ہوا کرتی تھی۔“  
 ”اب وہ آپ کو پہلے سے اچھی نظر آئیں گی۔“  
 ”ہم محل کب پہنچیں گے؟ کیا ملکہ کو معلوم ہے کہ ہم آچکے ہیں؟“ اس بار ائیل کمار نے  
 سوال کیا تھا۔

”بالکل مسٹر ائیل، لیکن وہ آج آپ سے ملاقات نہیں کر پائیں گی۔ شاہ، یورپ میں  
 ہیں اور کئی کام ایسے ہیں جو اُن کی غیر موجودگی میں ملکہ عالیہ کو نمٹانے ہیں۔ مجھے ان کی طرف  
 سے معذرت کرنے اور یہ پیغام دینے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ آپ سے کل ملاقات کریں  
 گی۔“

ائیل کمار نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”ہم محل کب تک پہنچیں گے؟ میں تھکن اتارنے کے لیے  
 شاور لینا چاہتا ہوں۔“  
 ”سامنے دیکھیں مسٹر ائیل، ہم پارک تک پہنچ چکے ہیں۔ محل یہاں سے زیادہ دور  
 نہیں۔“

”لیکن محل تو نظر نہیں آ رہا۔“ آدی نارائن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم  
 مرکزی دروازے سے کم از کم تین کلومیٹر اندر آچکے ہیں۔“  
 اُسی وقت کار ایک موڑ مڑی اور درختوں میں گھرا ہوا سُرخ پتھر سے تعمیر شدہ محل انہیں  
 نظر آ گیا۔

”مائی گاڈ!“ ائیل کمار بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ”دنیا کا دوسرا تاج محل۔۔۔“  
 کرل ٹوری کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ وہ یقیناً تاج محل کی خوبصورتی کا شہرہ سُن چکا تھا۔  
 محل کے داخلی کمرے میں پہنچتے ہی کرل ٹوری نے ایڑیاں بجا کر انہیں سلیوٹ کیا۔  
 ”مجھے اب اجازت دیں، معزز مہمانو! آپ دونوں کے الگ الگ سوٹ ہیں۔ آپ کا  
 سامان بھی وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ آپ نہادھو کر چاہیں تو اپنے کمرے میں کھانا منگوا سکتے ہیں  
 یا پھر دوسرے مہمانوں کے ساتھ فیملی ڈائننگ روم میں شریک ہو سکتے ہیں۔“  
 ”دوسرے مہمان؟“ ائیل کمار نے حیرت سے پوچھا۔

”ملکہ عالیہ کے والدین، مسٹر اینڈ مسز کلکرنی اور ایک فادر فلین وہاں ہوں گے اور مس سلٹی آج رات نیچے نہیں آئیں گی۔“

”مس سلٹی۔۔۔“

”مس سلٹی فاروق آف آکاش اسٹوڈیوز، بمبئی۔“

”شکریہ“ انیل کمار کے منہ کا مزا کر رہا ہو گیا۔ ”ہم دونوں اپنے کمرے میں ہی کھانا کھائیں گے۔ ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

○○



پیرس میں شام ڈھل رہی تھی۔ لیکن ٹریفک کا شور ایسا تھا جیسے کئی ٹرک بیک وقت کمرے میں آگھسے ہوں۔ ڈاکٹر گوتم نیلا مبرا اور اس کی بیوی گیتا نیلا مبرا ہوٹل پلازہ ایتھنٹر کے آرام دہ کمرے میں موجود تھے۔ جہاں ایک رات قیام کے بعد اگلی صبح انہیں ریال روانہ ہونا تھا۔

اچانک ہی ٹریفک کے شور کے ساتھ فون کی گھنٹی کا شور کمرے میں گونجنے لگا۔ گوتم نے چونک کر قدرے حیرت سے فون کی طرف دیکھا۔

”میں نے ہدایت کی تھی کہ صرف اہم ترین فون کی اطلاع ہی مجھے دی جائے۔“ گوتم نے زیر لب کہا۔

”ایسی کون سی اہم بات ہو سکتی ہے۔“ گیتا نے کہا اور فون اٹھانے کے لیے بڑھی لیکن گوتم نے اسے روک کر خود ریسور اٹھا لیا۔

”یس گوتم نیلا مبرا۔“

”سوری ٹوڈسٹرب یوسر!“ دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر فیرڈ بول رہا ہوں۔ شاہ رامیر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

گوتم نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا اور پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی تمام حسیں ایک دم بیدار ہو گئی تھیں۔

”گوتم!“ ٹیلی فون پر رامیر کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا۔“

”کہاں سے بول رہے ہو؟“

”برسلو سے۔“

”میں کل ریال میں تم سے ملاقات کروں گا۔ کیوں۔۔؟“

”میں برسلو میں مزید کئی دن ٹھہروں گا۔“  
 ”کیوں۔“

”ایک دوست کی وجہ سے، اُس کی ایک سہیلی بھی ہے تم یہیں چلے آؤ۔“  
 ”میں نہیں آسکوں گا، گیتا میرے ساتھ۔۔۔“

”میں شیتل کی پارٹی میں شرکت کے لیے ریاں نہیں جا رہا۔“ رامیر نے دھماکا کیا۔  
 ”اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے بغیر تم اور گیتا بھی وہاں بورہی ہو گے۔ تم شیتل کو ٹیلی گرام دے دو کہ تمہارا اور گیتا کا آنا کسی ناگزیر کام کی وجہ سے ناممکن ہے۔ اُسے اپنے بھارتی دوستوں کے ساتھ انجوائے کرنے دو اور تم اپنی بیوی کے ساتھ چھٹیاں مناؤ، میں دوبارہ پریشان نہیں کروں گا۔“

”رامیر!“ گوتم نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”تم سوئٹزرلینڈ میں چھٹیاں کیوں نہیں گزار رہے؟“

جواب میں رامیر کا تہقہہ سنائی دیا۔

”میری محبوب پیتا کے والدین نے اُس گھر میں میرے داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔“  
 رامیر نے جواب دیا۔ ”وہ ان دنوں اُسی کے پاس ہیں۔ پیا میری وجہ سے پہلے ہی بہت کچھ قربان کر چکی ہے، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اُسے مزید پریشان کروں۔۔۔ اور ہاں، گوتم۔۔۔ ایک کام اور، تم اریبہ سے ملو، پھر تم جو دیکھو اور سُنو، مجھے بتانا۔“

گوتم نے ریسوررکنے سے پہلے رامیر کو خدا حافظ کہا اور پھر گیتا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس عرصے میں بڑے غور سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مختصر اُسے رامیر سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ رامیر نے اُسے اریبہ سے ملنے کے لیے بھی کہا ہے۔

اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں گوتم بہت گندا آدمی تھا۔ اُس نے اپنے دماغ کے خلیوں کو ایک کمپیوٹر میں تبدیل کر رکھا تھا جس میں باقاعدہ فولڈر، سلاٹ، کیبنٹ اور باکس موجود تھے اور ان میں دُنیا بھر کے حقائق اور افواہیں جمع کر رکھی تھیں۔ اُسے اپنے دماغ پر فخر تھا کہ اُسے ذرا ذرا سی تفصیلات از بر تھیں۔ وہ جب چاہتا اپنے دماغ پر زور دے کر پورے واقعے کو ذہن کی اسکرین پر دیکھ لیتا۔

شہزادی اریہہ زاہدی کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ اُس کے دوست کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اس ناتے اُسے عزیز بھی تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ گیتا قطعی طور پر اریہہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ گوتم نے ایک بار دونوں کو ملوانے کی غلطی کی تھی لیکن یہ ملاقات جس طریقے سے اختتام پذیر ہوئی اس سے گوتم کو اُمید نہیں تھی کہ گیتا دوبارہ کبھی اُس کی صورت بھی دیکھنا پسند کرے گی۔

اس وقت اُس نے اپنے دوست سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ وہ اُس کی بیٹی سے ملے گا لیکن قباحت یہ تھی کہ وہ تعطیلات پر تھا اور اُس نے اپنے دن رات گیتا کو دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ گیتا کی موجودگی میں اریہہ کے ساتھ ڈنر، لنچ، بریک فاسٹ یا سیرا ہے ملاقات ناممکن تھی۔

لے دے کر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی تھی کہ وہ اریہہ سے فون پر بات کرے۔ وہ ریکس کے ساتھ ریوڈی یونیورسٹی پر رہتی تھی۔ اُس نے اپنے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ کسی طرح گیتا چند منٹ کے لیے ادھر ادھر ہو جائے تو وہ اریہہ سے بات کر لے۔ دوسری دُعا اُس نے یہ مانگی کہ اریہہ یا ریکس میں سے کوئی فلیٹ پر موجود نہ ہوتا کہ اُسے عدم موجودگی کا بہانہ مل جائے۔

گوتم نے یہ افواہ سن رکھی تھی کہ اریہہ اپنے والد کے خلاف بعض اقدامات میں ملوث

ہے لیکن جانے کیوں اُسے اب تک ان باتوں پر یقین نہ آیا تھا مگر سیاسی طور پر تھوڑا سا عقل مند شخص بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اگر ایسا ہے تو پھر اس کے محبوب ریکس کی سرگرمیاں، پیرس میں شاہ را میر کی خفیہ پولیس سے پوشیدہ نہ ہوں گی۔

بالآخر گوتم کو ایک بہانہ سوجھ ہی گیا جس سے وہ کچھ دیر کے لیے گیتا سے جان چھڑا سکتا تھا۔ اس وقت وہ اسی بہانے کی تکمیل کے لیے گیتا کے ساتھ ایک ٹیکسی کی عقبی نشست پر براجمان تھا۔ دونوں کی منزل فہرگ سینٹ ہینور پر واقع الیگزینڈر شاپ تھی۔ گیتا، الیگزینڈر پر مصروف رہتی اور گوتم اس عرصے میں اپنی چند بہت ہی ضروری کالیں نمٹا لیتا۔

”میرا اُن سے وقت طے نہیں۔“ گیتا نے اُسے بتایا تھا۔

”انہیں بتانا کہ تم سرگوتم نیلامبر ہو، پھر وقت طے ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ درپیش نہیں ہوگا۔“ گوتم نے اپنی بیوی کو جواب دیا ”اور الیگزینڈر سے کہنا کہ تمہارے شوہر کی خواہش ہے کہ بالوں کا اسٹائل ڈھیلا ڈھالا ہوتا کہ میں سے آسانی سے بگاڑ سکوں۔“ وہ چند ٹاپے رکا۔

”کئی بار۔“

گیتا کو الیگزینڈر چھوڑنے کے بعد گوتم واپس ہوٹل پلازا ایتھنز آ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اُس نے اریبہ کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

قسمت اُس کے ساتھ نہیں تھی، اریبہ گھر پر موجود تھی۔

”گوتم بول رہا ہوں بے بی، میں اور گیتا دونوں پیرس آئے ہوئے ہیں۔“

”کیا پھر ڈنر کی دعوت دے رہے ہیں، انکل؟“ اریبہ نے ہنستے ہوئے کہا کیونکہ پچھلے بار اریبہ اور گیتا کے درمیان گڑبڑ ایک ڈنر سے ہی شروع ہوئی تھی۔

”نہیں، بے بی۔“ گوتم شرمندہ سا ہو گیا۔ ”تمہارے والد نے برسلز سے مجھے فون کیا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تمہاری بحریت روانگی سے قبل اگر تمہارا کوئی مسئلہ ہو تو حل کر دوں، لیکن میں ملنے کی بات نہیں کر رہا، گیتا کے ساتھ تمہارا پچھلا ڈنر مجھے اب تک یاد ہے۔“

”کوئی سفارتی خیر سگالی؟“

”مشکل ہے، گیتا کو میں الیگزینڈر چھوڑ کر آیا ہوں اور اُس سے چوری بات کر رہا

ہوں۔“

”تو پھر آپ نے زحمت کیوں کی؟ پتا کی خفیہ پولیس میرے اور ریکس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔“

”یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں، اریہ، تم ریال جا رہی ہو؟“ گوتم نے بظاہر ناراضی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اریہ نے جواب دیا۔ ”اور یہ بھی سن لیں کہ تنہا جا رہی ہوں، ریکس میرے ساتھ نہیں ہوگا۔“

اُسی لمحے کمرے کے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ ”میرا خیال ہے دروازے پر کوئی ہے۔“ گوتم نے گھبرا کر کہا۔

”کیا آئی، الیکٹریڈر سے واپس آ گئیں۔“

”شاید۔“

”اور آپ خوفزدہ ہیں کہ کہیں وہ آپ کو مجھ سے باتیں کرتے نہ دیکھ لے۔“

”ہاں، یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی، خدا حافظ۔“ گوتم نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

اُسی لمحے گیتا دروازے پر نمودار ہوئی، اُس کے بال نئے انداز میں بنے ہوئے تھے اور وہ انہیں بگاڑے جانے کی منتظر تھی۔ گوتم اٹھ کر اُس کی جانب بڑھ گیا۔ اُسے اپنا وعدہ یاد تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک دھیمی مگر مسلسل تھی۔ وہاں جو بھی موجود تھا اُسے کوریڈور میں محافظوں کی موجودگی کے بارے میں علم تھا۔

شیتل نے کسماکر کروٹ لی، اُٹھ کر گاؤن پہنا اور ننگے پیر بیڈروم سے اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے تک آ گئی۔ اُسے یقین تھا کہ آنے والا ارون نہیں ہوگا۔ اُس کے پاس اپنی چابی تھی اور وہ فون کیے بغیر کبھی نصف شب کو نہیں آتا تھا۔ نہ ہی بچوں میں سے کوئی ہو سکتا تھا کیونکہ رامیر کی سخت ہدایت تھی کہ وہ رات کے وقت اپنے کمروں سے نہ نکلیں۔ اُن کا رہائشی حصہ بالکل الگ تھا اور وہاں ایسے انتظامات کیے گئے تھے کہ وہ اپنے طور پر ہی اپنی ضروریات پوری کر لیں اور انہیں ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو۔ یہ سب سوچتے ہوئے شیتل نے دروازہ کھول دیا۔

سلمیٰ دروازے کے باہر کھڑی تھی۔

”رات تین بجے کیا گزربڑھ گئی؟“ شیتل کے چہرے پر آنے والی کوفت کی پرچھائیاں معدوم ہو گئیں۔

”کوئی خاص نہیں۔“ سلمیٰ نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو کرلو،“ شیتل نے مسکرا کر دروازہ بند کیا اور اُسے لے کر بیڈروم میں چلی آئی۔ سلمیٰ نے صوفے پر پیر پارے اور کسی دوسری بات کا انتظار کیے بغیر اُس نے اپنی کھانا شروع کر دی جو ساری کی ساری قاہرہ میں فاروق کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر مشتمل تھی۔

”دیکھو سلمیٰ!“ اُس کی بات ختم ہونے پر شیتل نے اُسے مخاطب کیا۔ ”ہم سہیلیاں ضرور ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہماری قسمت اور عادتیں ایک جیسی ہوں۔ تم ڈکھ برداشت کر

لیتی ہو کہ دکھ ملنے پر تمہیں خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن دکھ مجھے کوئی خوشی نہیں دیتے۔ میری حالت تم سے مختلف نہیں لیکن میں تمہاری طرح خاموش گھوڑی نہیں ہوں، میری لگام کسی فاروق یا رامیر کے ہاتھوں میں نہیں، اسی لیے میں نے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

سلسلی نے پلکیں جھپکائیں۔ ”جانے کا فیصلہ کیا ہے؟ لیکن کہاں۔۔۔؟“

”میں بحریت چھوڑ رہی ہوں۔“ شیتل نے انکشاف کیا۔ ”لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں، طویل عرصے کے لیے، میں بمبئی واپس جانا چاہتی ہوں، ایک یا ایک سے زیادہ فلموں میں کام کرنے کے لیے۔“ اُس کی آواز بتدریج بلند ہو گئی۔ ”میں وہ کرنے جا رہی ہوں، جو میں کرنا چاہتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے، میں دوبارہ اپنی زندگی کی مالک بننا چاہتی ہوں۔“

”اوہ، اسی لیے تم نے ان بد معاشوں کو یہاں بٹلا رکھا ہے۔“ سلسلی نے حیرت سے کہا۔

”میں نے آدی نارائن اور انیل کمار کی جھلک دیکھی ہے، ایسا نہ ہو وہ تمہیں بے وقوف بنا دیں۔“

”انھیں ابھی تک میرے منصوبے کا علم نہیں۔“

”لیکن وہی کیوں؟ تم اگر کسی فلم میں کام کرنا چاہتی تھیں تو میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟ تم جانتی ہو کہ میں آکاش اسٹوڈیوز کی۔۔۔“

”تمہارے لیے فاروق ہی کافی ہے۔“ شیتل نے اُس کی بات کاٹی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ تم مالکوں سے ایک کے بجائے دو دو کی سفارشیں کرتی پھرو۔“

”سفارشیں؟ تمہیں واپس آکاش لانا تو میری کامیابی تصور کیا جاتا۔“

”کیا تمہیں واقعی اس بات کا یقین ہے؟ یاد رکھو، شیتل کلکرنی عرصہ ہوا اسکرین سے غائب ہو چکی ہے۔ وہ پرانے وقتوں کا فسانہ ہے۔ بے شک فلم بین اُس وقت اُس کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن اب میری پہچان صرف یہ ہے کہ میں ایک بادشاہ کی بیوی ہوں۔ کیا میں واقعی ایک اشار ہوں یا لوگوں کے دلوں سے محو ہو چکی ہوں؟“

”تم پوری دُنیا میں جانی پہچانی جاتی ہو۔“

”وہ تو گریس کیلی بھی جانی پہچانی جاتی ہے، کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر آج وہ ہالی وڈ واپس چلی جائے تو آج کے بچے اسے قبول کر لیں گے؟ ملکہ ریتا کے بارے میں کیا خیال

ہے؟ اُس نے بھی ایک بادشاہ سے شادی کی تھی، اُس کے فلمی کیریئر کا کیا بنا؟ یا ریٹا ہیو تھ کو لے لو، علی خان کی شہزادی یاسمین بن کر اُس کے پاس کیا بچا؟ فطری طور پر میری سوچ سب سے پہلے تمہاری طرف ہی گئی تھی لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری خاطر تم کوئی خطرہ مول لو۔“

”تمہارا خیال ہے کہ اُن دونوں کو کوئی خطرہ نہیں؟“

”آدی نارائن کو کوئی اور فنانسر مل سکتا ہے، کوئی ایسا بے وقوف صنعت کار جو اسکرین سے ہٹ کر میرا عجباری ہو اور جو باکس آفس کو میری اور تمہاری طرح نہ جانتا ہو، لیکن آدی نارائن بھی تنہا کچھ نہیں، میرا اور انیل کمار کا نام پندرہ سال بعد جب دوبارہ سامنے آئے گا تو ہو سکتا ہے ہم کلک کر جائیں۔“

”اور رامیر کیا سوچے گا؟“

”اُسے ابھی اس کا پتا ہی نہیں۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”خوش قسمی سے وہ بلجئیم میں رک گیا ہے، اور جب تک وہ ریال پینچے گا میں آدی اور انیل کو جیت چکی ہوں گی۔ میرا فیصلہ رامیر کے لیے حیران کن ہوگا لیکن اُس نے مجھے بُری طرح کھلا ہے اور اب میری باری ہے۔“



سلیٹی جب اُس کے کمرے سے نکلی تو صبح کا اُجالا پھیلنے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ شیتل اُس کے جانے کے بعد بھی بے خواب لیٹی رہی۔ وہ سونا چاہتی تھی لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس وقت وہ نیند کی گولی نہیں لینا چاہتی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر اُس نے اپنی پرائیویٹ ٹیلی فون لائن پر اردن کو کال کی جو اسکول ہاؤس کے برابر اپنے کالج میں موجود تھا۔

”پروفیسر!“ اُس نے ڈوبتی ابھرتی آواز میں کہا۔ ”مجھے نیند نہیں آ رہی، کوئی ایسی مصروفیت جس سے وقت گزرنے کا احساس مٹ جائے۔“

”جہاں ہو، وہیں رہو، ہلنا مت، میں آ رہا ہوں۔“ نیند کے خمار میں ڈوبی اردن کی آواز آئی۔

”نہیں، چری! وہ نہیں، نصف گھنٹے بعد مجھے درختوں کے جھنڈ میں ملو۔“ شیتل نے ہنستے ہوئے کہا اور ریسپور رکھ دیا۔

درختوں کے جھنڈ اُن کی محبتوں کے امین تھے۔ رامیر جب محل میں ہوتا تب بھی اُن کے معمول میں فرق نہ آتا تھا۔ ایک بار انہوں نے اپنے جذبوں کے فسانے ان درختوں کی چھاؤں چھاؤں رقم کیے تھے لیکن شیتل اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ درختوں کے سائے، کمروں کی دیواروں کی طرح اچھے راز دار نہ تھے۔ چنانچہ دونوں ہی اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ ”آؤٹ ڈور محبت، اُن کے لیے نہیں تھی۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ یہاں صرف باتیں ہوا کریں گی۔ محبتوں کی کہانیاں رقم کرنے کے لیے محل بہت بڑا ہے۔“

نصف گھنٹے بعد شیتل، انہی درختوں کے سائے تلے اردن کو اپنی بمبئی واپسی کے منصوبے سے آگاہ کر رہی تھی۔

”تم کتنے عرصے کے لیے جانا چاہتی ہو؟“

”چھ یا سات ماہ کے لیے۔“ شیتل نے جواب دیا۔

”تو میں اتنا عرصہ دیواروں سے سرکھپاؤں گا؟“

”تم ہر سال امریکہ تو جاتے ہو، اس بار جاؤ تو بمبئی کے راستے چلے جانا اور بیٹے کے نام کی آدھی ٹھکنیاں میرے نام کر دینا۔“

ارون نے فوراً حامی بھر لی۔

سورج ابھر کر سامنے آیا تو دونوں واپس روانہ ہوئے۔ بحریت کی مسلح افواج کا کمانڈر انجیف جنرل شاہد عجیب محل کی سیڑھیوں پر شیتل کا منتظر تھا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی اُس کی طرف بڑھا۔

”ویلم ہوم، جنرل۔“ شیتل نے خوش دلی سے اُسے مخاطب کیا۔ ”شاہ فہد کے ساتھ

مذاکرات کیسے رہے؟“

”کامیاب، ملکہ عالیہ۔“ جنرل شاہد نے بصد احترام کہا۔ ”انہوں نے جو بل

تقریبات کے بعد بحریت کے نجی دورے کی دعوت قبول کر لی ہے۔“ جنرل نے ذرا توقف کیا پھر اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ”میرے پاس ملکہ عالیہ کے لیے ایک پیغام موجود ہے، پلیز مسٹر ارون۔۔۔ اف یو ڈونٹ مائنڈ۔۔۔“

اور ارون، جنرل کی بات سمجھ کر اسکول کی طرف چل پڑا۔

”کیا پیغام اتنا اہم تھا کہ میرے ناشتے تک انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔“ شیتل نے خفگی

سے کہا۔

”پیغام ایسا تھا کہ شاید آپ فوراً سننا چاہتیں۔“ جنرل نے صفائی پیش کی۔

”کہو!“

”شاہ معظم کا پیغام ہے، وہ آپ سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن آپ موجود نہ تھیں

پیغام انہوں نے مجھے دے دیا ہے کہ شاید وہ پروگرام کے مطابق بلیم سے واپس نہ آسکیں۔“

”لیکن ہمارے مہمان؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں؟“

”وہ جانتے ہیں اور انہیں دونوں کے لیے اس ہفتے کی اہمیت کا احساس بھی ہے۔ ضرور

سلطنت کا کوئی اہم معاملہ ہی ہوگا۔ مسٹر گوتم بھی شاہ معظم کے ساتھ مصروف ہیں۔ اُن کی آمد

میں بھی تاخیر کا امکان ہے۔“

”کیا پیغام صرف یہی تھا۔“

”جی ملکہ عالیہ انہوں نے آپ کے لیے اور بچوں کے لیے نیک خواہشات کا پیغام

بھی دیا ہے۔“

”تھینک یو۔“ ملکہ شیتل کا ردِ عمل حیران کن تھا۔ ”جو ہوا درست ہوا، معاملات کچھ اور

آسان ہو گئے۔“

شیتل نے حیران جزل کو وہیں چھوڑا اور بیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

oo

بیڈروم سے لے کر ڈائننگ ہال تک کے راستے میں بحریت کے سابق بادشاہوں کی تصاویر آویزاں تھیں اور انیل کمار راہداری میں سے گزرتے ہوئے اُن سب پر عجیب و غریب تبصرے کرتا آیا تھا۔ آدی نارائن نے اُسے خفیہ مائیکروفون نصب ہونے کے بارے میں متنبہ بھی کیا لیکن وہ انہیں خوفناک، دہشت ناک، وحشت ناک اور پتا نہیں کیا کیا ناک کہتا آیا تھا۔

ڈائننگ روم میں آکر انیل بُری طرح ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں شیتل کے بارے میں بحث کر رہے تھے، لیکن انیل کے جبرے بھی تیز رفتاری سے چل رہے تھے۔ وہ ناشتے میں اس بُری طرح مصروف تھا کہ اُسے یا آدی نارائن کو اپنے پیچھے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کا احساس بھی نہ ہوا۔

شیتل خوبصورت ترین لباس میں اندر داخل ہوئی یہ کپڑے اُس نے اسی موقع کے لیے بطور خاص پیرس سے خریدے تھے۔ جونہی انیل کو کمرے میں شیتل کی موجودگی کا احساس ہوا اُس کا منہ اور ہاتھ دونوں بیک وقت رک گئے۔ آدی اور اُس نے اپنے چاقو اور فورک پلیٹ میں رکھے اور کرسیاں دھکیل کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”شیتل“، انیل کمار کے حلق سے بے اختیار آواز نکلی ”تم تو جادو گرنی ہو، تم نے وقت کو اپنے چہرے پر ساکت کر لیا ہے۔“

”تھینک یو“، شیتل نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ چھوا اور آدی نارائن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”آنے کا شکریہ، پیارے دوست۔“ اُس نے بڑھ کر اُس کے رخسار پر سیب کی دوقاشیں ثبت کر دیں۔ ”کتنا طویل عرصہ گزر گیا ہے لیکن مجھے بمبئی ائر پورٹ پر اپنی پہلی ملاقات آج بھی یاد ہے۔“

”تمہارا بھی شکریہ شیتل، جس نے مجھے ملکہ بحریت کو دیکھنے کا موقع عنایت کیا۔“

آدی نارائن نے جواب دیا۔

”میرے لیے تو یہ جذباتی ملن ہے۔“ انیل نے کہا۔

”ہاں۔“ شیتل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اُس کی آنکھوں میں انیل سے آخری ملاقات کا منظر ناچ اٹھا تھا۔ وہ تعریفی نظروں سے دونوں کا جائزہ لینے لگی۔ ”ناشتا جاری رکھو دوستو! میری خواہش تھی کہ تمہارے ساتھ ناشتا کرتی لیکن یہ وقت اسکول ہاؤس کے دورے کا ہے میرے بچے میرے منتظر ہیں۔“

”دوبارہ ملاقات کب ہوگی؟“ آدی نارائن نے پوچھا۔

”تقریباً ایک گھنٹے بعد، ریسپشن ہال میں۔“

”کورڈور کے آخری سرے پر؟“ انیل نے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ شیتل نے مُڑتے ہوئے کہا۔ ”لیکن انیل یاد رکھنا وہ پورٹریٹ جودیواروں

پر آویزاں ہیں، حریت کے سابق شاہوں کے ہیں۔ اُن کے بارے میں غلط تبصروں کو محل میں پسند نہیں کیا جائے گا۔“

آدی اور انیل نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا لیکن شیتل دروازے کی طرف بڑھ چکی تھی۔

اسکول کے دورے میں دھیتا اور سوہن بھی شیتل کے ہمراہ تھے۔ دونوں کے درمیان چلتی ہوئی شیتل کالج کی کوئی طالبہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے سفید جیمز اور رنگین شرٹ پر مشتمل خالص غیر شاہی لباس پہن رکھا تھا۔

”شیتل۔“ اسکول اور بچوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے سوہن نے اچانک ہی بدلے ہوئے انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ ”تمہیں یاد ہے نا کہ ہم نے تمہاری تربیت میں کیسے کیسے کٹ اٹھائے ہیں لیکن بھگوان کی کرپا سے اب تم خود اس قابل ہو گئی ہو کہ ہم جیسوں کی مدد کر سکو کیونکہ۔۔۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں، انکل؟“ شیتل نے اُس کا جملہ درمیان سے ہی اچک لیا۔

”رقم۔“ سوہن نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میرا کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔ اُس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے ضروری ہے کہ میں اس میں سرمایہ کاری کروں لیکن میرے پاس وسائل نہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سہارا دو۔“

”کیا آپ لوگ میرے لیے انجام دی گئی خدمات کا صلہ چاہتے ہیں؟“ شیتل نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

”تم اپنی بے شمار دولت میں سے کچھ اگر میرے کاروبار میں لگا دو گئی تو گھنٹوں کے بل بیٹھا ہوا سوہن پھر اٹھ کھڑا ہو گا۔“

”انکل۔“ شیتل نے غور سے اُسے دیکھا۔ ”یہ تو وقت بتائے گا کہ اس وقت گھنٹوں کے بل کون بیٹھا ہے، آپ یا میں، پھر بھی میں آپ کی درخواست پر غور کروں گی۔“

وہ آگے بڑھ گئی اور دھیتا نے جواب تک خاموش تھی اپنے شوہر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اُسے سوہن کے مطالبے پر اعتراض تھا۔

”دیکھو وجیتا۔“ سوہن نے حتی انداز میں اُسے مخاطب کیا ”شیتل سے کچھ حاصل کرنا میرا حق ہے لیکن تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اپنے خون پسینے کی کمائی اُس پر خرچ کی ہے۔ اب اگر اُس سے کچھ لے لوں گا تو کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ تم میری بیوی ہو، میری کمر میں سوئی چھونے کے بجائے اُسے سہلاؤ، مجھے تمہاری حمایت کی ضرورت ہے۔“

oo

آدی نارائن اور انیل کمار محل کے وسیع و عریض لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔  
 ”کیا وہ میرے سلوک کو نظر انداز کر دے گی؟“ انیل کمار نے سگریٹ کا کش لیتے  
 ہوئے آدی نارائن سے دریافت کیا۔  
 ”اور میں سوویں دفعہ تمہیں یاد دلارہا ہوں کہ اُس نے خود ہمیں بلایا ہے۔“ آدی نے  
 رنج ہو کر جواب دیا۔

”وہ تمہاری مخالف کبھی نہیں رہی لیکن ممکن ہے اُس نے مجھے دلدل میں دھکیلنے کے لیے  
 یہاں بلایا ہو۔“  
 ”اگر تمہارے دل میں یہ خوف رنج بس گیا ہے تو پھر یہی کہوں گا کہ آئیڈیا برا نہیں، تم  
 اسی قابل ہو۔“  
 ”وہ آخر خود کو اتنی پُر اسرار بنا کر کیوں پیش کر رہی ہے؟“ انیل بالکل بچوں کی طرح  
 بحث کر رہا تھا۔

”میرے اپنے اندازے کے مطابق وہ دوبارہ فلمی دنیا میں داخل ہونا چاہتی ہے۔“  
 ”لیکن میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟“  
 ”تم اس کے آخری ہیرو تھے۔ تمہارے ساتھ مل کر وہ اپنے پرانے چاہنے والوں کو  
 اکٹھا کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا کہ جب وہ اس میں کامیاب ہوگئی تو تمہارا مستقبل  
 تاریک ہو جائے گا پھر تم اُس کے کندھوں تک بھی نہ پہنچ پاؤ گے۔“  
 ”میں اُس سے نفرت کرتا ہوں۔“ انیل نے سگریٹ کا آخری کش لے کر پیروں سے  
 ٹکڑے کو مسلطے ہوئے کہا۔ ”میں اس دلدل میں گرنے کو قطعی تیار نہیں۔“  
 ”اب بھی تو تم گمنامی کے گڑھوں میں ہی ہو۔“

انیل نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کم از کم میں پیشہ ورانہ طور پر زندہ تو ہوں،



وہ چاہتی ہے کہ میں کسی کُتے کی طرح عقبی ناگوں پر کھڑا ہو کر اس سے رحم کی بھیک مانگوں اور وہ اپنا انتقام لینے میں کامیاب ہو جائے۔“

”یہ بات بعد کی ہے کہ تم بچیلی ناگوں پر کھڑے ہو کر اُس سے رحم کی بھیک مانگتے ہو یا اگلی ناگوں پر جھک کر اس کے تلوے چاٹتے ہو، فی الحال ریسپشن ہال میں چلو، وہ ہماری منتظر ہوگی۔“

انیل نے چونک کر گھڑی دیکھی اور پھر ریسپشن ہال کی طرف بڑھ گیا۔ آدی نارائن اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔

شیتل نے مسکراہٹوں کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا۔ آرام دہ نشستوں پر بیٹھنے کے بعد شیتل نے اُن سے پوچھا تھا کہ کیا وہ سہان نوازی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں یا نہیں۔ آدی نارائن نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”تم تو جنت میں رہ رہی ہو شیتل۔“ انیل نے کمرے کی خوبصورتی اور سجاوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کامیاب شادی، سراہنے اور محبت کرنے والا شوہر، بچے اور سر پر حرم کی کوئی دھمکی۔۔۔“

”رامیر کے دادا نے شاہی حرم پر پابندی عائد کر دی تھی۔“ شیتل نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اُن کا خیال تھا کہ ایک وقت میں ایک مرد کے لیے ایک ہی عورت کافی ہے۔“

”تم تو بہت خوش ہوگی؟“

”میں مطمئن ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ آدی کرسی کے کنارے کھسک آیا۔

”ہاں۔“ شیتل نے پلکیں جھپکائیں۔ ”مجھے اور چاہیے بھی کیا؟“

”تعریف، جوش و خروش۔“ آدی نارائن نے برجستہ کہا۔ ”زندگی کی رنگینیاں جو اطمینان سے کہیں آگے کی چیزیں ہیں، تم جنت جیسی جگہ پر ضرور رہ رہی ہو لیکن جنت سے بہت دور ہو، سچ بتانا تمہیں ان کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟“

”کس چیز کی کمی؟ تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔“

”بہنئی۔“ آدی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”فلمی دنیا کی سنسنی، ساتھی اداکاروں کی

محفلیں۔۔۔ تمہیں یاد ہیں نا وہ رنگین دن؟ سیٹیوں کا شور، روزانہ رش پر نٹ دیکھتے وقت ذہنی کھنچاؤ اور ایسے بہت سے دوسرے ہنگامے، یہ اطمینان جو تمہیں یہاں حاصل ہے تمہارے لیے ناکافی ہے۔“

”تمہارے جیسی نو جوان عورت کے لیے۔“ انیل نے لقمہ دیا۔

”نو جوان؟“ اُس نے مصنوعی خفگی سے اپنے سابق ساتھی اداکار کو دیکھا۔ ”میری عمر اڑتیس سال ہے اور تم انیل۔۔۔ عمر میں اُس لڑکی سے تین گنا بڑے ہو جسے کینز کے فلمی میلے میں ساتھ لے گئے تھے۔“

”کیا۔۔۔؟“ انیل نے غصیلی نگاہوں سے اُسے گھورا۔

”ہاں۔۔۔ وہ لڑکی کیا نام تھا اُس کا۔۔۔؟ جو تمہاری اپنی بیٹی سے بھی عمر میں چھوٹی ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ سنیتا، ہمیں فلم کی ٹاپ گرل۔“ انیل کمار نے شرمندگی سے کہا۔ ”وہ سمجھتی ہے کہ میں اُسے مزید آگے بڑھنے میں مدد دے سکتا ہوں۔ انڈسٹری میں اب بھی میرا نام ہے۔“

”تم کیا بچوں کی طرح جھگڑنے بیٹھ گئے؟“ آدی نے دخل اندازی کی۔ ”تم دونوں اپنے زمانے کے جادوگر تھے میں تصور کی آنکھ سے وہی کچھ دوبارہ رونما ہوتے دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا رونما ہوتے دیکھ رہے ہو؟“ شیتل نے چلیں جھپکائیں۔

آدی نے گرم لوہے پر چوٹ لگائی۔ ”اچھی کہانی، ماہر ہدایت کار۔۔۔ اور شیتل و انیل۔۔۔ اسکرین کے ساحر۔۔۔ فلمی دُنیا کے دیوی، دیوتا۔۔۔“

”اور آدی نارائن پروڈیوسر؟“ شیتل نے گرہ لگائی۔

”بالکل۔“ آدی نارائن نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ ”یہ بھارت کی فلمی تاریخ کا ایک

عظیم واقعہ ہوگا، تمہاری آخری فلم ’سائے‘ سے بھی بڑا۔“

”مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم دونوں یہ منصوبہ لے کر ہی یہاں آئے ہو۔“ شیتل نے

کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اندر سے اُس کے من میں لذت پھوٹ رہے تھے جو وہ خود کہنا

چاہتی تھی وہ دونوں اپنی زبان سے کہہ رہے تھے۔ ”تم دونوں میرے مہمان ہو، فی الحال ہماری مہمان نوازی سے لطف اٹھاؤ۔“ اس نے رُک کر تین بارتالی بجائی، فوراً ہی ایک باوردی آفیسر اندر آ گیا۔ ”لیفٹیننٹ ناگی! میرے دوستوں کا خیال رکھو۔ میں چاہتی ہوں کہ یہاں ان کا قیام عرصے تک یادگار رہے۔“ وہ دوبارہ مہمانوں کی طرف مڑی۔ ”ہم اب کاک ٹیلو پر ملیں گے لیفٹیننٹ ناگی تمہاری رہنمائی کرے گا۔“

آدی نارائن اور انیل کمار دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ شیتل نے عقب سے پکار کر آدی کو مخاطب کیا۔ ”مایوس مت ہونا، جو کچھ تم نے کہا ہے میں اُس پر غور کروں گی۔ ایک عورت آسانی سے اپنا ذہن بدل سکتی ہے۔“

انہوں نے مڑ کر اُمید بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن اس عورت کے لیے بڑا مشکل کام ہوگا۔“ شیتل نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ ”ایک ملکہ کے پاس بدلنے کے لیے ذہن کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“

”اپنی آمد کو شاہانہ بناؤ، شیتل۔“ اُسے آج بھی اپنے سب سے پہلے فلمی ہدایت کار راجیش بھٹناگر کے الفاظ یاد تھے جو اُس نے پہلے فلمی شاٹ کے موقع پر اُسے کہے تھے۔ ”اپنا سر بلند رکھو، گردن سخت اور چال ملاؤں جیسی ہو۔“

اور شیتل اُس کی ہدایت کے عین مطابق کمرے کی آنکھ کے سامنے آئی تھی۔ اپنی ٹھوڑی اٹھائے، متمنائے چہرے اور جگمگاتی آنکھوں کے ساتھ اُس نے اپنی ساڑھی ذرا سی اٹھائی اور شہزادیوں جیسی چال کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر اپنے سب سے پہلے ہیرودھر میندر کی بانہوں میں ساگئی تھی جو اُس وقت جنرل کی وردی میں ملبوس تھا۔ پورے سیٹ پر شور مچ گیا۔ وہ اب تک فلم انڈسٹری میں آنے والی شاید پہلی اداکارہ تھی جس کے پہلے سین کے ری ٹیک کی ضرورت نہیں پڑی تھی، پہلی ہی کوشش کامیاب رہی تھی۔

آج شب نقیب نے جب سنگ روم کا دروازہ کھولا تو اُسے اپنا پہلا سین یاد آ گیا۔ لیکن آج اس سیٹ پر کمرے، ہدایت کار، اداکار اور معاون موجود نہیں تھے۔ فلم کا جانا بچانا شور نہیں تھا اور نہ ہی کسی ہدایت کار نے بآواز بلند کٹ کہنا تھا۔

آج کی ہدایت کار وہ خود تھی۔ کاسٹ کے جوادا کار سامنے بیٹھے تھے وہ اتنے سستے نہ تھے کہ ایک دن کی تنخواہ لے کر گھروں کو ٹل جاتے۔

سب سے پہلے اٹیل نے اُسے دیکھا۔ وہ فوراً کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ دوسروں نے اُس کی تقلید کی۔ شیتل نے اپنی مخصوص کرسی سنبھالنے سے پہلے تمام لوگوں سے فردا فردا مصافحہ کیا۔ تمام لوگوں کے چہرے متمنا رہے تھے۔

آدی نارائن نے شراب کی بوتل اٹھائی۔ ”میں ملکہ کا جامِ صحت تجویز کرنا چاہتا ہوں۔“ شیتل نے ہاتھ اٹھا کر اُسے منع کر دیا۔ ”ابھی نہیں، ڈنر کے بعد، اور جام میں خود تجویز کروں گی۔“

ڈنر مکمل ہوتے ہی ہر گرسی کے عقب میں کھڑے ملازم نے میز کی صفائی شروع کر دی۔ طویل وعریض میز چشم زدن میں صاف ہو گئی۔

بٹلرز کی آنکھیں ملکہ پر مرکوز تھیں، یونہی اس نے پلکیں جھپکائیں وہ روبوٹوں کی طرح حرکت میں آ گئے۔ فوراً ہی تمام مہمانوں کے سامنے شیمپین کے گلاس رکھ دیے گئے۔

شیتل کی نگاہیں اپنے ایک ایک مہمان کا چہرہ پڑھ رہی تھیں۔ جونہی بٹلر اپنے کاموں سے فارغ ہوئے، شیتل کی پلکیں دوبارہ جھپکیں چیف بٹلر فوراً اپنی ملکہ کے سامنے ٹھک گیا۔

”تمام ملازمین کمرے سے باہر چلے جائیں۔“ شیتل نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”دروازے کے قریب بھی کسی شخص کو موجود نہیں ہونا چاہیے۔“

لحوظ میں کمرہ مہمانوں کے سوا تمام ملازمین سے خالی ہو گیا۔ شیتل اپنا گلاس تمام کمرہ میز کے آخری سرے پر اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

”کوئی اور اٹھنے کی زحمت نہ کرے۔“ اُس نے دوستوں کو مخاطب کیا۔ ”جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں اُسے سن کر تمام لوگ بیٹھے رہنے کو ترجیح دیں گے۔“ اُس نے اپنا گلاس اٹھا کر لہرایا ”میں جام تجویز کر رہی ہوں جو میرے ہی لیے ہے۔ میں اپنی زندگی کے ایک ایسے دوراے پر پہنچ چکی ہوں جہاں میرے لیے ایک اہم فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا ہے اور میں وہ فیصلہ کر چکی ہوں۔“

اُس نے ذرا ساڑک کر حاضرین کا جائزہ لیا۔ ”ممکن ہے میرا فیصلہ آپ میں سے کچھ کے لیے غیر متوقع ہو لیکن بہت جلد آپ سب کو میری پوزیشن کا احساس ہو جائے گا۔ جب میرے شوہر واپس آ جائیں گے تو میں انہیں وہ سب کچھ بتا دوں گی جو میں اس وقت آپ کو بتانے جا رہی ہوں۔۔۔ تقریبات کے بعد، میں نے بحریہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں یہی واپس جا رہی ہوں۔“

کمرے میں اچانک ہی بہت سی سرگوشیاں گونج اٹھیں۔ شیتل نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”اور میرا ارادہ کبھی واپس نہ آنے کا ہے۔“ اُس نے دوسرا دھماکا کیا۔  
 ”میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی سلٹی فاروق نے کرسی دھکیلی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”تم نے کیا کہا؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھے تو تم نے بتایا تھا کہ۔۔۔!“  
 شیتل تھکے تھکے سے انداز سے مسکرائی۔  
 ”خواتین و حضرات! میں تخت سے دستبردار ہو رہی ہوں۔“

”مائی گاڈ، تم نے تو زبردست دھماکا کیا ہے۔“ سلٹی نے آتش دان میں مزید کونکے انڈیلے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت شیتل کے بیڈروم میں پھیلی ہوئی تھی۔ ”کیا تمہیں دستبرداری کا اعلان کرنے کے لیے وہی بے وقوفوں کا جھرمٹ ملا تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ مجھ میں اداکاری کے جراثیم پھر پیدا ہو رہے ہیں۔“ شیتل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور میرے خیال میں تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔“

”نا ممکن، میں۔۔۔“

”ایک حد تک تو یہ ہو چکا۔“ سلٹی نے اُس کی بات کاٹی۔ ”گزشتہ شب تمہارا انداز مختلف تھا۔“

”بکومت۔“ شیتل نے پیار سے اُسے ڈانٹا۔ ”جو فیصلہ میں نے آج سنایا ہے وہ اُس وقت بھی میرے ذہن میں تھا جب میں نے دعوت نامے پوسٹ کیے تھے۔ تمہیں اور فادر فلین کو یہاں بلانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ مجھے اخلاقی سہارا دو۔ میں اتنی پریشان ہوں کہ تمہیں کیا بتاؤں؟“

”بتا کیوں نہیں دیتیں؟“

”میرے اس فیصلے کی بنیاد لوڑانے کی ایک عورت پیتا، بنی ہے۔“ شیتل نے مختاط انداز میں کہا۔

”تو پہلے بھی رامیر کی زندگی میں لڑکیوں کی کیا کمی رہی ہے۔“

”اب صورت حال مختلف ہے۔ پیا، رامیر کی بیوی ہے اور دونوں کا ایرک نامی ایک بیٹا بھی ہے۔۔۔“

سلٹی ششدر رہ گئی۔

”بچوں کا کیا بنے گا؟“ کافی دیر بعد سہیلی گویا ہوئی۔

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ شیتل نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔ ”رامیر چاہے گا کہ بچوں کے ذریعے مجھے پریشان کرے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ بچے ہماری مشترکہ ملکیت ہیں میرے خیال میں وہ انہیں گزند پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا ورنہ ملک کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں اُس کا وقار خاک میں مل جائے گا۔“

”وہ تو تمہارے فلم میں لوٹ جانے سے بھی ہوگا۔“

”نہیں، رامیر کو بیوی کی نہیں، تلوے چائے والی کُتیا کی ضرورت ہے۔ بیوی کی حیثیت سے میرے بہت سے حقوق ہیں لیکن اُس نے ایک بھی پورا نہیں کیا۔ میرے جانے پر وہ پیرس کے مشہور ترین درزی سے سلا ہوا اپنا بہترین فوجی یونیفارم زیب تن کرے گا۔ اُس پر اسکول کے دنوں میں سوئمنگ میں ملنے والے تمنغے سے لے کر آج تک ملنے والے تمام اعزازات سجائے گا اور ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو کر قوم کو آگاہ کرے گا کہ ملکہ بحریت، جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہے اور جو اُسے بے پناہ چاہتی ہے، اپنے فلمی کیریئر سے الگ ہو کر خوش نہیں تھی۔ وہ ایک فن کارہ ہے، عظیم فن کارہ، اور میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی محبوب بیوی کے اندر کی فن کارہ کو مارنے کا مجرم قرار پاؤں، سو میں نے اسے فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ جملے کہتے ہوئے سُتے بھی بہائے۔“

سہیلی کے پاس کہنے کو اب شاید کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور بیڈ روم سے باہر نکل گئی۔ شیتل نے محض مسکرا نے پر ہی اکتفا کیا تھا۔



”اب ہم تنہا ہیں۔“ انیل کمار نے باغ کے دُور دراز کونے میں پہنچ کر آدی نارائن کو مخاطب کیا۔ ”لیکن تم نے مجھے میز کے نیچے سے ٹانگ کیوں ماری تھی؟ میں تو اُسے اس فیصلے پر مبارک باد دینا چاہتا تھا، خوش ہونا چاہتا تھا کہ چینی گڑیا اور بھارت کی فلمی دیوی پھر ہماری آغوش میں آ گئی ہے۔“

”تم ہلے درجے کے بے وقوف ہو۔“ آدی نارائن نے اُس کی اتنی لمبی چوڑی بات کے جواب میں محض ایک ہی جملہ کہا تھا۔

”بے وقوف میں ہوں یا تم؟“ انیل نے چیس بہ چیس ہو کر کہا۔ ”اچھے خاصے گرم کمرے سے نکال کر یہاں بُھوتوں کی طرح درختوں کے سائے میں کھڑا کر دیا ہے۔“

”یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ آدی نارائن نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ”یہاں بھی آہستہ بولو ہو سکتا ہے درختوں میں بھی خفیہ مائیکروفون نصب ہوں۔ اُسے بھول جاؤ کہ شیتل نے کیا کہا تھا۔ صرف یہ یاد رکھو کہ ہمارے الفاظ اس وقت بھی براہِ راست اُس کے کمرے میں پہنچ سکتے ہیں۔“

”بسمیٰ واپس جانے کی خواہش کا اظہار خود اس نے کیا ہے، ہم نے تو اُسے مجبور نہیں کیا۔“

آدی نے ایک طویل سانس لی۔ ”عقل سے کام لو انیل، اُس کے واپس آنے سے ہمیں کیا مل جائے گا؟ ہم نے کسی ملکہ یا کسی طاقتور ترین شخص کی دلربائیوں کا خواب نہیں دیکھا۔ اب اُس کے ساتھ سابق کا دُم چھلا لگ چکا ہے۔ صرف سابق اداکارہ کا ہی نہیں، سابق ملکہ کا بھی، تم خود ہی بتاؤ کہ کون کسی سابق کے لیے اپنا مستقبل داؤ پر لگائے گا؟ ثریا یاد ہے تمہیں؟ وہ شاہ ایران کو کوئی عہد نہ دے سکی تو اُسے طلاق ہو گئی۔ اُسے فلم اِستار بنانے کے بڑے منصوبے بنے لیکن ہاتھ کیا آیا؟ وہ سابق تھی اور سابق کا مطلب ہے کچھ نہیں۔ پیئر

سابق بادشاہ یوگوسلاویہ، یا کانستانتین یونان کا سابق بادشاہ، وہ ایک بار اپنے تخت سے اتر کر دیکھیں کوئی انہیں دیکھنے کے لیے ایک پائی بھی نہیں دے گا۔“

”مگر یہاں یہ صورت حال نہیں ہے۔“ انیل نے احتجاج کیا۔ ”وہ اب بھی شیتل کلکرنی ہے، اگر ملکہ کی دُم اس کے ساتھ لگ گئی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”دُم؟ ارے نام معقول یہ تو بنیادی حقیقت ہے۔ بے شک اُس کا شمار دُنیا کی دس خوبصورت ترین خواتین اوّل میں ہوگا لیکن کیا کلکتہ کی کھولیوں اور سیٹاپور کی میڑھی میڑھی گلیوں میں رہنے والا کوئی شخص اس سابق ملکہ کو دیکھنے کے لیے ڈیڑھ روپے کا ٹکٹ خریدے گا۔ شیتل کے اسکرین سے غائب ہونے کے بعد سینکڑوں خوبصورت لڑکیاں اسکرین پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ ڈمپل کپاڈیہ، نیتو سنگھ، زینت امان، ہیمالنی، جیہ بہادری، بیتا، راکھی، ریکھا، پروین بوبی، یوگیتا بالی، موسمی چڑجی اور کتنے نام گنواؤں میں جنہیں۔ اب بھلا فلم بین ایک کھوکھلے جسم کو اسکرین پر دیکھنے کیوں کر آئیں گے؟“

”لیکن ہمیں فنانس تو کوئی اور کرے گا۔“

”بے شک، مگر میں افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ ہماری صنعت کی زبان کے مطابق وہ بینک اسبل نہیں ہے۔“

”ناممکن۔“

”بہی سچ ہے انیل۔“ آدی نارائن نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”شیتل کے لیے پیسے کوئی اُس کی شکل دیکھ کر نہیں دے گا بلکہ وہ اُس کی حالیہ کامیاب فلموں کی فہرست دیکھے گا اور شیتل کے پاس خوبصورت چوکھٹا تو ہے، خوبصورت ماضی نہیں۔“

”انیل کمار نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔“ تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”سب سے پہلے ہم واپس بمبئی جا کر پرانے دوستوں کی طرح اُس سے بات کرتے ہیں۔“ آدی نارائن نے جواب دیا۔ ”ہم اُس کے مفادات میں دلچسپی ظاہر کریں گے لیکن اُسے مجبور کریں گے کہ وہ دستبرداری پر نظر ثانی کرے۔ ہم اُسے بتائیں گے کہ وہ اب بھی بہت زیادہ خوبصورت ہے لیکن اُس کی یہ خوبصورتی ایک طاقتور شاہ کی ملکہ کی حیثیت سے تو لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے، پندرہ سال پرانی اداکارہ کی حیثیت سے نہیں۔“

”درست۔“ انیل نے ہنکارا بھرا۔

”ہم اُسے بتائیں گے کہ محل سے باہر کی دُنیا اس کے لیے بہت سرد ہے، وہ فی الحال اُسی کی پناہ میں رہے۔ رہ گئی دستبرداری، تو وہ قلمی دُنیا میں دوبارہ قدم جما کر اس فیصلے پر عمل درآمد کر سکتی ہے۔“

انیل نے گرم جوشی سے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور دونوں محل میں لوٹ آئے۔

”لغت بھیجواُس پر۔“ وجیتا نے اپنے شوہر کی جانب سے شیتل کی وکالت پر برہم ہو کر کہا۔

”آہستہ۔“ سوہن ٹلکرنی نے اُسے سرزنش کی۔ ”یاد رکھو اب وہ سری ٹکمر کی یتیم شیتلا نہیں، بحریت کی ملکہ شیتل رامیر ہے کوئی بھی تمہاری بات سُن کر اُسے آگاہ کر سکتا ہے۔“

”تمہیں یا مجھے اس سے کیا فائدہ؟“ وجیتا نے ناک سکڑی۔ ”تم تو اُس سے مالی مدد حاصل کرنے آئے تھے اور وہ یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لے۔“ سوہن ٹلکرنی نے اپنی بیوی کو بتایا۔ ”میں اُسے یاد دلاؤں گا کہ وہ طلاق لے رہی ہے اور ہمارے مذہب میں طلاق۔۔۔“

”تمہارا مذہب؟“ وجیتا نے طنزیہ انداز میں اُس کی بات کاٹی۔ ”کون سا مذہب؟ کیا تم بھول گئے ہو کہ وہ اب ہندو نہیں ہے، عرصہ ہوا ہندو اسے بھول چکے ہیں، رامیر کو صرف یہ کہنا ہے، میں نے تمہیں طلاق دی، اور اگلے ہی لمحے وہ پھر یتیم شیتلا کی طرح گلی میں کھڑی ہوگی۔“

”میں اس بات کی کوشش بھی کروں گا کہ وہ دوبارہ ہندو مذہب اختیار کر لے اور اس کے لیے میں ایک بڑی قیمت بھی لگاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری پیش کش اُسے خریدنے میں کامیاب ہو جائے گی۔“

”اپنے کاروبار کے لیے تو تمہارے پاس بھوٹی کوڑی بھی نہیں اور چلے ہو اُسے بھاری پیش کش کرنے، پاگل ہو گئے ہو؟“

”تم دیکھتی جاؤ، کیا ہوتا ہے۔“ سوہن نے شاطرانہ انداز میں کہا۔ ”وہ میری بات ضرور سنے گی کیونکہ میں بہر حال اُس کا خونی رشتے دار ہوں۔“

شیتل نے آنکھیں کھول کر بڑی بڑی کھڑکیوں کے بلٹ پروف شیشوں سے اندر آنے والی دھوپ کا جائزہ لیا اور دوبارہ تنگیوں میں سرچھپا لیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے قریب پڑے ہوئے دوسرے میلے ہوئے ٹیکے کو بھیج لیا۔

اُسے یاد نہیں تھا کہ ارون کس وقت اُس کے پاس آیا تھا۔ ممکن ہے سلی نے اسے بھیجا ہو یا پھر اُس نے خود فون کر کے اسے بلایا ہو۔ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اُس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ تادیر اُس کے ساتھ رہا تھا۔ اُس نے اُسے تخت سے دستبرداری کے متعلق بتایا تھا۔

”تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، جان۔“ ناراض ہونے کے بجائے ارون نے اُسے یقین دلایا تھا۔ ”تمہیں جب اور جہاں میری ضرورت محسوس ہوگی میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

اور اُس نے خود کو ارون کے مضبوط حصار میں چھپا لیا تھا۔۔۔ شیتل نے ہڑبڑا کر دوبارہ سراٹھایا۔ اب ارون نہیں تھا، اُس کا مضبوط حصار بھی نہیں تھا۔ وہ تنہا تھی اور اُسے ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ وہ نیم دلی سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جلد از جلد تیار ہو جانا چاہتی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ رات کو اُس کے منہ سے دستبرداری کا فیصلہ سننے کے بعد اُس کے مہمان سو نہ سکے ہوں گے اور اب تب میں کوئی نہ کوئی اُس سے ملنے کے لیے آنے والا ہوگا۔

”کیری، کون ہے؟“ اُس نے ڈرائنگ روم کے دُور افتادہ کونے سے دروازے پر موجود اپنی ملازمہ سے بہ آواز بلند دریافت کیا۔ اُسے کسی مرد سے کیری کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

”ملکہ کو بتاؤ کہ فادر فلین اُس سے ملنے آیا ہے۔“ مرد کی آواز ابھری۔  
لڑکی اُلٹے قدموں پیچھے ہٹی۔ پلٹ کر اُس نے اپنی مالکن کو دیکھا اور پھر جھک کر اُس نے فادر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ شیتل نے دوسرا اشارہ کیا اور کیری دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ اب کمرے میں شیتل اور فادر فلین تنہا تھے۔ ملکہ نے اُنھیں فادر کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

”آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے فادر۔“ شیتل نے بوڑھے فادر کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

”تمہارے فیصلے سے مجھے بھی بے حد خوشی ہوئی ہے۔“ فادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”اب میں مطمئن ہوں۔“

شیتل نے پلکیں جھپکا کر فادر کو دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔  
”آپ ہمیشہ سچ بولتے رہے ہیں فادر، اس لیے مجھے صاف صاف بتائیے گا۔“  
”یہ ایک شرمناک کہانی ہے شیتل، جس میں خود میں بھی ملوث ہوں۔“  
”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”حالانکہ اس کا تعلق تم سے ہے۔“

”مجھ سے؟“

”جلد ہی صورت حال تم پر واضح ہو جائے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دستبردار ہو رہی ہو۔“  
”لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ؟“

فادر نے اُس کے سوال پر کوئی توجہ نہ دی۔ ”تم بھارت واپس آ رہی ہونا؟ یعنی گھر آ رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”تب تو پھر تم ہندو مذہب اختیار کر لو گی؟“ فادر نے فوراً دریافت کیا۔ ”میرا تعلق عیسائی مذہب سے ہے لیکن میری خواہش ہے کہ ہر کوئی اپنی اصل کولوٹ جائے، خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی، یہودی ہو یا بدھ مت کو ماننے والا۔۔۔“

”ہندو مذہب؟ سالوں گزر گئے کہ میں نے اس طرح کا تصور بھی نہیں کیا۔ شروع میں میں ضرور ڈر گئی تھی لیکن اب تو ہندو مت بہت پیچھے رہ گیا۔“

”اس سلسلے میں بھی میں خود کو قصور وار سمجھتا ہوں۔“

”پہیلیاں نہ بجھوائیں فادر۔“

”اسے چھوڑو۔“ فادر نے اس بار بھی کوئی وضاحت نہ کی۔ ”تمہاری دستبرداری کی ٹھوس وجوہات تو ہوں گی، اگر مناسب سمجھو تو بتا دو، کیا تمہیں شادی سے حقیقی خوشی نصیب ہوئی ہے۔“

شیتل مسکرائی۔ ”آپ مجھے کوئی اعتراف کرنے کو تو نہیں کہہ رہے کہ میں۔۔۔“

”غیر رسمی طور پر۔“

”تو پھر میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔“ شیتل نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”میری خوشیاں میرے بچے ہیں۔ رامیر کے ساتھ پہلے پانچ چھ سال تو بڑے رومانی گزرے لیکن بعد میں ہماری شادی شکوک و شبہات اور ابہام کی نذر ہو گئی، مگر اب یہ کہانی بھی ختم ہو گئی ہے۔ میرے شوہر کو میری ضرورت نہیں رہ گئی۔ وہ کسی اور سے پیار کرنے لگا ہے، اب میں اُس کی ملازمہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔“ شیتل کی آواز زندہ گئی۔ ”میں سب کچھ کھوپکی ہوں فادر۔“

”تب پھر تم مجھے معاف کر دینا، شیتل۔“ فادر نے سر جھکا کر کہا۔ ”تمہاری زندگی میں زہر گھولنے والا سب سے بڑا مجرم میں ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ شیتل سارا دکھ بھول گئی۔

”اگر میں کہوں کہ میں نے تمہیں ایک شاہ کے ہاتھوں بیچ ڈالا تھا تو اس میں کوئی جھوٹ

نہ ہوگا۔“

”گھل کر بات کریں فادر۔“ اُس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

”شاہ کے ساتھ تمہاری ملاقات سے قبل ڈاکٹر گوتم نیلا مبر میرے پاس آیا تھا۔ اُسے شک تھا کہ شاید تم رامیر سے شادی کرنے اور اپنا مذہب تبدیل کرنے پر تیار نہ ہو۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ دنیا میں صرف ایک شخص ایسا ہے جو تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کر سکتا ہے اور وہ میں ہوں۔ میں انتہائی شرمندگی سے یہ اعتراف بھی کروں گا کہ رامیر نے تم سے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شادی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر گوتم نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ایک سیاسی شادی ہے۔ رامیر کو بھارت سے اسلحہ دیا گیا تھا اور اس کے لیے کوئی مقبول بھارتی لڑکی بہترین سیزھی ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تمہارا انتخاب عوام میں تمہاری مقبولیت کے باعث اُس سیزھی کے طور پر کیا گیا تھا جس پر چڑھ کر رامیر اپنے مقاصد حاصل کر سکتا تھا۔ گوتم اور خود رامیر نے تمہیں مجھ سے ملنے کا مشورہ دیا اور تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تمہاری شادی کی حمایت کی تھی۔ میں صورت حال جانتا تھا لیکن میں نے تمہیں اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔“

شیتل کا دماغ گھوم گیا۔ اُس نے جس ہستی کو قابل اعتماد سمجھ کر اپنی پریشانیوں میں حصہ بنانے کے لیے بلایا تھا وہ اسے نئی کہانی سنارہی تھی۔ وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی۔

”لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”گوتم نے مجھے رامیر کی جانب سے سری نگر میں ایک یتیم خانہ اور ایک چرچ تعمیر کروا کر دینے کی پیش کش کی تھی۔“ فادر نے جواب دیا۔ ”اُس نے اپنے وعدے کی تکمیل بھی کی، میں نے اپنے مذہب سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا لیکن یہ دکھ بھی تھا کہ میں نے کسی دوسرے کو اُس کے مذہب اور ملک سب دور کر دیا ہے اور شاید دھوکا بھی دیا ہے مگر تمہاری کامیاب شادی کی خبریں سن سن کر میرے دل کو ڈھارس ہوتی تھی کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ البتہ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں نے خدا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”تو اب آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ شیتل جانے کس طرح خود کو سنبھالے ہوئے

تھی۔



”کیونکہ میں نے تمہاری شادی کے بارے میں محض انواہیں سنی تھیں، کیونکہ تمہاری تکلیفوں کا ذمہ دار میں ہوں۔ اس لیے ہر روز خداوند سے معافی مانگتا ہوں لیکن مجھے معاف کیے جانے کا کوئی اشارہ نہیں ملا۔ میرے دل میں اب بھی پچھن ہے اس لیے تم سے درخواست ہے کہ مجھے معاف کر دو۔“

”تو آپ یہ اعتراف کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟“

”ہاں۔“

”صرف اپنے اطمینان کے لیے؟“ شیتل نے پچھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”یہ جانے بغیر کہ آپ کے لالچ کے باعث میں نے پندرہ سال کانٹوں کی تیج پر گزارے ہیں۔“

”مجھے اس بات کا علم نہیں تھا، شیتل۔“ فادر نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔ ”جب تم نے دستبرداری کا اعلان کیا، اُس وقت مجھے اس بات کا شک گزرا تھا اور میری غلطی میرے لیے ایک عذاب بن گئی۔“

”اب آپ چاہتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ ساتھ میں بھی آپ کو معاف کر دوں؟“ شیتل اپنی جگہ سے اٹھ کر فادر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کا پورا بدن کانپنے لگا تھا۔ ”یہاں سے چلے جائیں فادر۔“ شیتل کی آواز خطرناک حد تک بلند ہو گئی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے بوڑھے شیطان۔۔۔ تم نے مجھے اپنے لالچ کی بھینٹ چڑھا دیا۔۔۔ بوڑھے دلال۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔ میں زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔۔۔۔۔“

فادرلین کے ساتھ انتہائی گرم گرم ملاقات کے باوجود شیتل نے اپنے دوسرے ملاقاتیوں کا استقبال ہنسی خوشی کیا تھا۔ اُس کے چہرے پر گزرے واقعات کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ نئے آنے والے انیل کمار اور آدی نارائن تھے۔

”ہم نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ انیل کمار نے اپنے لیے براڈی انڈیلے ہوئے رسما در یافت کیا۔

”مجھے تمہارے آنے کی توقع تھی۔“

”تمہیں ہونی بھی چاہیے تھی۔“ آدی نارائن بات چیت کو آگے لے کر چلا۔ ”گزشتہ

شب ہم نے تمہارے بارے میں بڑے طویل صلاح مشورے کیے ہیں اور اس وقت ہم تمہیں یہ بتانے آئے ہیں کہ تمہاری بمبئی واپسی سے ہم بے حد خوش ہیں۔ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ ہم تمہارے منصوبوں میں شامل ہیں؟“

شیتل نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کیا تم اپنے تابناک مستقبل کے بارے میں بات کرنا پسند کرو گی؟“

شیتل نے دوبارہ سر ہلایا۔

”ہم یہاں تمہاری دستبرداری پر بات کرنے نہیں آئے یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“

آدی نے بات کر کے تائید کے لیے انیل کی طرف دیکھا لیکن وہ براڈی میں مصروف تھا چنانچہ اُس نے بات دوبارہ شروع کر دی۔ ”دستبرداری کے کئی فائدے ہیں اور کئی نقصان، ہمیں فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے فنانسز سے شیتل ملکر نی کی ایک سے زائد فلموں کا معاہدہ کر سکیں گے۔“

”اور نقصان۔۔۔“

”صرف تمہاری ذات کو ہے۔“ آدی نارائن نے جواب دیا۔ ”اس وقت ملکہ ہونا

تمہاری پہچان ہے، دستبرداری تمہاری پہچان کو ختم کر دے گی۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو تا کہ تم جب چاہو ملکہ کی حیثیت سے ریال واپس آ جاؤ۔ پہلے فلمی پانیوں میں اتر کر دیکھو۔ کنارے لگ گئیں تو بے شک دستبردار ہو جانا ورنہ تمہارا محل تمہارے لیے بہترین جائے پناہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

شیتل کے لیے آدی نارائن کا مشورہ ہتھوڑے سے کم نہیں تھا۔ کل وہ انہیں خزانوں سے مالا مال سمندر نظر آتی تھی اور آج اُس کی حیثیت ایک خشک کنویں سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ کیونکہ اب اُس کے ساتھ سابق لکنے والا تھا۔ وہ بے وقوف تھی جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ اُس کے پاس استعمال کرنے والوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوستوں کی حیثیت سے آئے تھے۔ اُس کا جی تو چاہا کہ اُن کے ساتھ بھی فادر فلین جیسا سلوک کرے لیکن کچھ سوچ کر اُس نے ارادہ ملتوی کر دیا اور تھکے تھکے سے انداز میں ملازمہ کو بلانے کے لیے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”میں اس بارے میں سوچوں گی۔“ اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیری تمہیں باہر لے جائے گی، میرے پاس دوسرے ملاقاتی آنے والے ہیں، ممکن ہے آج رات ہم دوبارہ ملیں۔“

”بولیس، میں سن رہی ہوں۔“ ایک کھنٹے بعد شیتل اپنی خالہ و جیتا ٹکڑی کی اور خالو سوہن ٹکڑی سے باتیں کر رہی تھی۔ موضوع تخت سے اُس کی دستبرداری ہی تھا۔

”تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد بچوں کا کیا ہوگا؟“ سوہن نے سوال کیا۔  
 ”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اُن پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔“ شیتل نے جواب دیا۔  
 ”میں اُن کا کیا انتظام کرتی ہوں، یہ آپ کا مسئلہ نہیں۔“

”لیکن تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا شاہ اس بارے میں سنتے ہی تمہیں ہلاک...؟“

”طلاق؟“ و جیتا نے فوراً اپنے شوہر کا جملہ اُچک لیا۔ ”تمہاری ماں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنے شوہر سے طلاق نہیں لی تھی۔ ہمارے خاندان میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے، لوگ کیا کہیں گے؟“

”تو دن بعد لوگ اسے بھول جائیں گے۔“ شیتل نے اطمینان سے جواب دیا۔  
 ”مگر طلاق ہی کیوں؟“ سوہن نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ”تجرباتی طور پر علیحدگی کیوں نہیں؟ بہت سے شہزادے شہزادیوں نے ایسا کیا ہے۔ پرنس برنارڈ یاد ہے، اُس نے ڈچ لیڈی جولیا تا سے علیحدگی اختیار کی اور بلا خردوں مل بیٹھے۔ شہزادی مارگریٹ اور لارڈ اسٹونڈن کی شادی بھی اختلافات کا شکار رہی۔ انہوں نے علیحدگی ضرور اختیار کی لیکن طلاق کے لیے بچوں کے بڑے ہونے کا انتظار ضرور کیا۔ جیکی کینڈی کی مثال تمہارے سامنے ہے، اُس کا شوہر تو تمہارے شوہر سے بھی بڑا پلے بوائے تھا پھر تم۔۔۔“

”اٹکل۔“ شیتل نے ہاتھ اٹھا کر اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”آپ اور آنٹی فی الحال آرام کریں، اور ہمارے درمیان جو مختصر سی بات چیت ہوئی ہے اسے فی الحال بھول جائیں۔ دوپہر کو آپ لوگ خیموں کے شہر کی سیر کو جا رہے ہیں، رات کو ڈنر پر ملاقات ہوگی۔“

گیتا نیلامبر وسیع وعریض بیڈ پر آڑی تر چھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ ذرا دیر پہلے ہی اپنے شوہر کے ہمراہ پیرس سے ریال پہنچی تھی۔ طویل فلائٹ نے اُسے تھکا دیا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ گوتم کے ساتھ کچھ دیر آرام کرتی لیکن محل پہنچتے ہی استقبالیہ ہال میں ڈاکٹر گوتم نیلامبر کی ملاقات درباری امور کے انچارج کرنل صمد مسعودی سے ہو گئی تھی جو اُسی کا منتظر تھا۔ کرنل صمد نے جوڑے کا مسکراہٹوں کے ساتھ خیر مقدم کیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ گوتم کو لے کر ایک کونے میں کھسک گیا تھا۔ کچھ دیر اُن کی سرگوشیاں جاری رہی تھیں اور پھر گوتم تھکے تھکے انداز میں اُس کے پاس آیا تھا۔

”تم کمرے میں چلو گیتا، میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔“

گوتم جواب کا انتظار کیے بغیر کرنل صمد کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور اب ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا لیکن گوتم کی کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا؟

گیتا کے بیڈ روم سے خاصے فاصلے پر ایک بند دروازے کے عقب میں بیٹھا ہوا گوتم نیلامبر اُس انکشاف کا منتظر تھا جو کرٹل صمد کرنے والا تھا۔ اُسے اُس وقت بے حد حیرت ہوئی جب کرٹل نے فوری بات شروع کرنے کے بجائے اپنی میز پر بیٹھ کر پینل سے آڑی تر چھی لکیریں بنانی شروع کر دیں۔

”یہ کیا ہے؟“ گوتم نے احتجاج کیا۔ ”میں ایک طویل سفر کر کے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کے ساتھ آرام کروں۔“  
 ”وہ جارہی ہیں۔“ کرٹل نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ”انہوں نے یہ انکشاف گزشتہ شب ڈنر کے موقع پر کیا ہے۔“

”کون جارہا ہے؟ اور تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”ملکہ عالیہ، تخت سے دستبردار ہو رہی ہیں۔“

گوتم کے لیے خبر اتنی اچانک تھی کہ وہ بے اختیار کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”یہ سچ ہے۔“ کرٹل نے اُس کی تقلید کی۔ ”شاہ معظم کو اس کی خبر نہیں اور نہ ہی میں نے

کسی کو بتایا ہے، خُدا کا شکر ہے کہ آپ میری رہنمائی کے لیے یہاں آ گئے ہیں۔“

”کیا بے وقوفی ہے؟ میرا ذہن تمہارے الفاظ قبول نہیں کر رہا۔ تمہیں یہ بے وقوفانہ خبر

کہاں سے ملی؟“ گوتم دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”موسیو برائر سے۔“ کرٹل صمد نے جواب دیا۔ ”وہ چیف ڈائمنگ روم اسٹیورڈ ہے اور

تناؤ سے دار ہے کہ اُس سے کسی جھوٹ یا غلط بیانی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ملکہ نے ڈنر کے

بعد تمام لوگوں کو کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا تھا تا کہ وہ اپنے بھارتی دوستوں سے گھل کر

نجی گفتگو کر سکیں۔ کمرہ تو خالی ہو گیا لیکن موسیو برائر دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس

نے ملکہ کا یہ جملہ خود سنا ہے کہ میں تخت سے دستبردار ہو رہی ہوں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ شاہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا؟“ گوتم نے پوچھا۔

”اگر انہیں علم ہوتا وہ فوری طور پر واپس آ جاتے۔“

”تب پھر ہمیں ہر حال میں انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ کیا تمہیں علم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟“  
”بلجینم میں۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، چند روز پہلے انہوں نے برسلز سے مجھے فون بھی کیا تھا۔ وہ

کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

”اپنی نجی رہائش گاہ میں، اُن کے چیف آف اسٹاف اور بعض اعلیٰ افسران اُن کے  
ہمراہ ہیں، شاہ باڈون نے خود اُن کے لیے انتظامات کیے ہیں، میرے پاس اُن کا فون نمبر  
ہے۔“

”تو پھر تمہیں انتظار کس بات کا ہے؟ نمبر ملاؤ۔“

”کک۔۔۔ کون۔۔۔ اُن سے بات کون کرے گا؟“ کرٹل کی آواز لڑکھڑائی۔

”میں کروں گا، بے وقوف، تم نمبر ملاؤ۔“ گوتم نے غصے سے جواب دیا۔

دونوں افراد ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بلجیم کی کال ختم ہو گئی تھی۔  
 ڈاکٹر گوتم نیلامبر کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ نروس انداز میں انگلیاں چٹخا رہا تھا۔  
 ”وہ اُسے نہیں ڈھونڈ سکتے، اُن کا کہنا ہے کہ شاہ دیہی علا۔ ق میں وقت گزار رہا ہے  
 نہیں جانتے کہ کہاں۔ میں نے انہیں بتایا کہ شاہ سے بات کرنا بے ساراہم ہے تو انہوں نے  
 دریافت کیا کہ معاملہ سیاسی ہے، گھریلو ہے یا پھر بچوں کا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ گھریلو  
 ہے تو انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ جونہی اُن کا شاہ سے رابطہ ہو وہ میری کال کے بارے میں بتا  
 دیں گے۔“

”ہمارے پاس وقت بالکل نہیں۔“ کرل صد نے جواباً کہا ”ڈنر میں شریک کوئی بھی  
 شخص باہر بات کر سکتا ہے، ہمیں ہر حال میں شاہ کو اس سے آگاہ کرنا ہوگا۔“  
 ”ہمیں؟“ گوتم نے حیرت سے پوچھا۔

”جی سر! ہمیں، شاہ کسی ایک کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔“  
 گوتم نے ایک ہاتھ کاٹکا بنا کر دوسری ہتھیلی پر مارا ”پہلے میں ملکہ سے بات کروں گا، ہو  
 سکتا ہے تمہارے تجربے کچھ زیادہ چٹھالی ہو، ہماری خوش بختی ہے کہ شاہ سے ہمارا رابطہ نہیں  
 ہوا۔ ہمیں پہلے ملکہ سے بات کرنی چاہیے۔“  
 ”میں آپ کے لیے نیک تمنائوں کا اظہار کرتا ہوں۔“



ڈاکٹر گوتم نیلا مبر صرف چند منٹ اپنے اپارٹمنٹ میں رکا اُس نے مختصر ترین الفاظ میں گیتا کو صورت حال سے آگاہ کیا اور شیتل سے ملاقات کو چل دیا۔

وہ اس وقت سوئمنگ پول میں پیراکی کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو گوتم ٹھنک کر رہ گیا۔ ظالم اس عمر میں بھی اتنی خوبصورت تھی کہ بچاری اُس کے لیے مندر اور زاہد مسجد چھوڑ سکتا تھا۔ وہ مختصر لباس میں پانی میں انکھیلیاں کرتی ہوئی کوئی جل پری لگتی تھی۔

جونہی اُس نے گوتم کو دیکھا وہ اسی حالت میں پول سے باہر نکل آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یورپی انداز میں خوش آمدید کہا۔ شیتل کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی جب کہ گوتم کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

”تم پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو شیتل۔“

”آخر کار، پیارے گوتم، تم نے کوئی تو ایسی بات کہی جس پر میں آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتی ہوں۔“ شیتل نے نفرتی قبضہ فضا میں بکھیرا اور ایک بڑا سا تولیہ اٹھا کر پلیٹ لیا پھر وہ ایک ایزی چیئر پر دراز ہو گئی۔

”آؤ، ادھر بیٹھو۔“ اُس نے ساتھ والی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ ”گیتا کیسی ہے؟ میرا خیال ہے آرام کر رہی ہوگی۔ تمہارا اپارٹمنٹ آرام دہ تو ہے نا؟ فلائٹ کیسی رہی؟ اور ہاں پیرس کیسا تھا؟“ شیتل نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

گوتم نے اطمینان کا سانس لیا۔ شیتل کے کسی انداز سے کوئی خطرہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کرٹل صمد کو برا بھلا کہا اور شیتل کے سوالوں کا جواب دینے لگا۔

”کل فادر فلین سے میری ملاقات ہوئی تھی۔“ اُس کے خاموش ہونے پر شیتل نے اُسے بتایا۔

”وہ سری نگر کا پادری؟“ گوتم نے جھٹکے سے سر اٹھایا ”مجھے یاد ہے وہ۔“

”تمہیں یاد ہونا چاہیے کیونکہ تم نے اُسے تباہ کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے، وہ با اعتماد آدمی تھا لیکن تم نے اُس سے اُس کا اعتماد چھین لیا۔“

”اُس سے جو وعدے کیے گئے تھے، پورے کیے جا چکے ہیں۔“ گوتم کا اعتماد رفتہ رفتہ لوٹ رہا تھا۔ ”اُس کا خالق اُس کے کرٹوتوں کو ضرور معاف کر دے گا۔“

”لیکن تمہیں کون معاف کرے گا؟“

گوتم نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے کسی معافی کی ضرورت نہیں، مجھے ایک ذمہ داری دی گئی تھی، سو میں نے پوری کی۔ تم نے اور رامیر نے ایک کامیاب ازدواجی زندگی۔۔۔“

”سیاسی ازدواجی زندگی۔“ شیتل نے اُس کی بات کاٹی۔

گوتم نے دوبارہ کندھے اچکائے۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ معاملات کیسے شروع ہوئے۔ پرنس رنیر اور گریس کیلی کی ملاقات کا اہتمام بھی ایک پادری نے ہی کیا تھا۔ وہ ایک مثالی شادی ہے یوں بھی تمام شادیاں اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہی کی جاتی ہیں۔ تم نے اپنا مقصد حاصل کیا اور رامیر نے اپنا، تم دوسری بہت سی دہنوں سے خوش قسمت رہیں کیونکہ تمہارا دلہا ہتھیلی پر سر رکھ کر تم سے محبت کرتا ہے۔“

”تھوڑی تھوڑی۔“

”ہر شے بدل جاتی ہے۔“

”خیر تم یہ بتاؤ کہ تم گیتا کے بغیر مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟“ شیتل نے لا جواب ہو کر موضوع بدلا۔ ”گلنا ہے کوئی دھماکا خیز معاملہ لائے ہو اور ممکن ہے تم میرے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو؟“

”کیا وہ سچ ہے جو میں نے سنا؟“

”ہاں۔“

”کیا تم نے رامیر کو بتا دیا ہے۔“

”میں نے برسلز فون کیا تھا۔ میجر بیجن نے رامیر سے میری بات نہیں کرائی، یہ شاہ کا حکم ہے، اُس نے مجھے بتایا، ہر میجسٹری آ رام کر رہے ہیں اور میں کسی ہنگامی صورت حال کے بغیر انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا، بیجن نے مجھ سے یہ کہا، رامیر کی بیوی سے۔۔۔۔۔“

”وہ بے وقوف آدمی ہے۔“

”میں پاگل ہو گئی ہوں۔ اسی وقت میں نے ایک دن بھی انتظار نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے منصوبے پہلے اپنے مہمانوں کو بتا دیے۔ ابھی تک رامیر کا ٹوکئی پیغام مجھے نہیں ملا۔“ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے گوتم کو دیکھا ”کیا تم نے بات کرنے کی کوشش کی ہے؟“

”ہاں۔“ گوتم نے اقرار کیا۔ ”لیکن تمہاری طرح کامیابی مجھے بھی نہیں ہوئی، ممکن ہے پوری کہانی ہی جھوٹ کا پلندہ ہو۔“

”شکر ہے تم نے اقرار تو کیا۔“

”تم کب جا رہی ہو؟“

”جوبلی تقریبات کے بعد جو نہی مہمان روانہ ہوں گے، میں پرواز کر جاؤں گی۔“

”لیکن اس وقت کیوں؟ رامیر کی دوست لڑکیوں کے بارے میں تو تم پہلے بھی جانتی تھیں۔ اور یہ بھی طے ہے کہ تمہاری جانب اُس کی توجہ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔“

”اب آگئی تھی۔ وہ میری مستغاضہ اور تھا لیکن ظاہر یہی کرتا تھا کہ کچھ نہیں سنا۔“

”میں نہیں مانتا۔“ گوتم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اُس کا اندازہ تھا کہ تم بمبئی واپس جانے پر اصرار کر دو گی اور میں نے اُس سے وعدہ لیا ہے کہ مناسب وقت پر وہ اس سلسلے میں تمہاری حوصلہ افزائی کرے گا۔“

”رامیر نے تم سے وعدہ کیا ہے؟“ شیتل ایک دم خوش ہو گئی۔

”ہمیشہ کی طرح اُس نے مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ اس سے جتنا فائدہ تمہیں ہوگا اتنا ہی بحریہ کو بھی ہوگا۔ وہ بھارت سے مزید خیر سگالی کے تعلقات چاہتا ہے۔“

”خیر سگالی کے تعلقات!“

”اور تمہاری خوشی بھی۔“ گوتم نے فوراً سنبھالا دیا۔ ”ہم سمجھتے ہیں کہ تم نے اپنے فلمی دوستوں کو یہاں کیوں بلایا ہے؟ اپنا راستہ ہموار کرنے کے لیے، اپنے گھر، اپنے وطن میں کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب ہم بھی تمہارے

ہی منصوبوں کی تکمیل کے لیے کام کر رہے تھے تو تم نے تخت سے دستبرداری کا فیصلہ کیوں کیا؟

یہ تو نا سمجھی کی بات ہے۔“

”نہیں۔“ شیتل نے زور دے کر کہا۔ ”یہ فیصلہ میں نے ایک دورے کے بعد

کیا ہے۔“

”گو تم کی آنکھیں سکو گئیں۔“ تم کہاں گئی تھیں؟“

”لوزانے، اور وہاں میری ملاقات پیتا اور رامیر کے بیٹے سے بھی ہوئی تھی۔“

دو پہر کو شیتل کے مہمان خیموں کے اُس شہر کے دورے پر گئے جہاں جو بلی تقریبات کا آغاز ہونا تھا۔ فادر رائے فلین اُن کے ہمراہ نہیں تھے کیونکہ وہ صبح سویرے ہی واپس بھارت چلے گئے تھے۔ کرنل نوری کو گائیڈ کے طور پر اُن کے ہمراہ کیا گیا تھا لیکن شیتل نے اپنے محبوب اردن کپور کو بھی ساتھ بھیجا تھا تا کہ آدی نارائن، انیل کمار، سوہن ٹککر نی یا دجیتا سوہن کوئی ایسی بات نہ کر سکیں جس سے شیتل کے منصوبے کا قبل از وقت انکشاف ہو جائے۔

مہمانوں نے خیموں کے عظیم الشان شہر، جس میں دُنیا کی ہر سہولت فراہم کی گئی تھی، سے زیادہ راستے میں بکھری ہوئی فوجی تنصیبات میں دلچسپی لی تھی۔ جا بجا فوجی چھاؤنیاں اور اڈے بنے ہوئے تھے۔ انداز ایسا تھا جیسے بحریہ حالت جنگ میں ہو۔ انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ شاہ رامیر زاہدی نے فوجی لحاظ سے بحریہ کو دُنیا کے چوٹی کے ممالک کے ساتھ لاکھڑا کیا ہے۔

کرنل نوری نے انہیں جو بلی تقریبات میں شرکت کے لیے آنے والے بادشاہوں، ملکاؤں، شہزادوں، شہزادیوں اور سربراہانِ مملکت، وزرائے مملکت اور دیگر اعلیٰ عہدیداران کے خیمے مرکزی بال روم، سوئمنگ پول، بار روم اور دیگر سہولتیں دکھائیں لیکن مہمانوں کا جی انہی فوجی تنصیبات میں انکار ہا جوہ راستے بھر دیکھتے آئے تھے۔

گوتم نیلامبر اور گیتا نیلامبر دوسری منزل پر واقع اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے شیش کے مہانوں کو خیموں کے شہر کے دورے سے واپسی پر بس سے اترتا دیکھ رہے تھے۔ نیلامبر ان ساری بے وقوفیوں سے قطعاً خوش نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کے جڑے کھنچے ہوئے تھے اور وہ ایک ایک کو دیکھ کر یوں مٹھیاں بھیج رہا تھا جیسے ابھی سب کا گلا دبا دے گا۔

”آخر تم نے دُنیا بھر کے مسائل کو اپنا در دوسر کیوں بنا رکھا ہے؟“ گیتا نے پیار بھرے انداز میں اپنے شوہر کا حصار بنتے ہوئے پوچھا۔ ”شیش اگر تخت سے دستبردار ہو رہی ہے تو تمہیں کیا؟ وہ ایک عام سی عورت ہے اور رامیر بھی یقیناً اُس سے تھک گیا ہوگا۔ اُس کے جانے سے ایک ہلکا سا دھماکا ہوگا۔ اخبارات چند روز اُس کے حوالے سے خبریں اچھالیں گے اور بس۔ پھر لوگ اُسے بھول جائیں گے۔ ویسے اُس کی عمر کیا ہے؟“

”اڑتیس سال۔“

”تقریباً چالیس سال۔“ گیتا نے اک ادا سے کہا۔ ”اُس کا فلمی کیریئر بے حد محدود ہے۔ جلد ہی وہ دوسری سابق شہزادیوں کی طرح خود کو شراب، بُوئے اور نو جوانوں کی دوستی میں گم کر دے گی۔ تم دیکھنا آج وہ ملکہ ہے لیکن بیسوا سے زیادہ۔۔۔۔۔“

”اسٹاپ اٹ۔“ گوتم نے اپنی بیوی کو جھڑکا۔ ”تمہارے مغز میں یہ باتیں نہیں سائیں گی، ہمیں اُس کی ضرورت ہے۔“

”کے ضرورت ہے، اُس دو نکلے کی عورت کی؟“

”ہماری حکومت کو اُس کی ضرورت ہے، وہ اس وقت بحریہ میں بھارت کی بہترین سفیر ہے۔ بھارت خلیج کے علاقے میں اپنی برتری اور دنیا کی چھٹی بڑی قوت بننے کی جو منصوبہ بندی کر رہا ہے شیش اس میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بھارتی حکومت شیش اور رامیر کی شادی کو میرا سب سے عظیم کارنامہ قرار دیتی ہے۔ میں نے ایک مسلمان سرزمین پر

ہندو بیچ بویا ہے اور اب جب وہ درخت بننے والا ہے تو میں کیسے اُسے تباہ ہو جانے دوں۔“  
 ”مجھے نہیں معلوم تم کیا اول فول کے جا رہے ہو؟“

”تم پر لے درجے کی بے وقوف ہو۔“ وہ اُس کی طرف گھوم گیا۔ ”شیتل، بحریت کو بھارتی اسلحے کی فروخت کی چابی ہے۔ وہ اگر یہاں سے چلی گئی تو مشرق وسطیٰ پر ہماری حکومت کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔ ہم یہاں اسلحہ ہی نہیں بھیجتے بلکہ ماہرین اور مشیروں کی شکل میں ایسے جاسوس بھی بھیج رہے ہیں جو بحریت اور اسلام کی جڑوں کو گھسن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ وقت آنے دو، رامیر کے محل پر ترنگانہ لہرایا تو میرا نام بدل دینا۔ میں اتنے کشت اسی دن کے لیے تو کاٹ رہا ہوں۔ شیتل ملکہ کی حیثیت سے سابق فلمی اداکارہ ہی نہیں ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔ وہ چلی گئی تو رامیر بھی ہمارے دشمنوں کی گود میں جا بیٹھے گا۔ تمام بھارتی شہریوں، ماہرین اور مشیروں کو سمندر میں دھکیل دیا جائے گا۔ ہم خلیج پر حکمرانی کرنے کے بجائے اسی میں ڈوب مریں گے، شیتل اس وقت ایک طوفان کے سامنے کھڑی ہے۔ ہمیں طوفان روکنا ہے یا شیتل کے قدم مضبوط کرنے ہیں۔“  
 ”لیکن گوتم۔۔۔“

”بکومت، جو میں کہہ رہا ہوں صرف وہ کرو، تم میری بیوی ہو، شیتل صرف کوئی سیاسی شخصیت نہیں بلکہ اس وقت وہ دنیا کی سب سے اہم ترین عورت ہے۔“

شیتل نے ہاتھ اٹھایا اور کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ساتھ ہی سامنے کی دیوار پر ایک قد آدم اسکرین روشن ہو گئی۔ اُس نے اپنے مہمانوں کو آج ایک سر پرانز دینے کے لیے محل کے پروجیکشن ہال میں بلایا تھا۔ جونہی اسکرین پر پہلا منظر ظاہر ہوا انیل کمار اچھل کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”سائے۔“ وہ چلایا۔ اُس کی آواز میں خوشی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ ”ہماری آخری فلم، ڈاٹ اے ونڈر فل ٹریٹ، شیتل۔“ (کیا حیرت انگیز خوشی ہے، شیتل)۔

”خاموش بیٹھو، بہنئ کے بونگے۔“ اندھیرے میں کہیں سے سلمیٰ فاروق کی آواز اُبھری۔ ”یوں لگتا ہے جیسے کسی بھکاری کے سامنے مرغ مسلم رکھ دیا گیا ہو۔“

”پندرہ سال گزر گئے شیتل۔“ انیل کمار نے سلمیٰ کی بات کا قطعیہ برا نہیں منایا۔

انیل اور سلمیٰ آپس میں الجھے رہے۔ شیتل جسمانی طور پر دونوں کے قریب لیکن ذہنی طور پر اُن سے بہت دور تھی۔ وہ اُن وجوہات پر غور کر رہی تھی جن کے تحت اُس نے، ’سائے‘ دکھانے کا اہتمام کیا تھا۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ سوہن اور وجیتا کلکرنی اور خاص طور پر گوتم نیلامبر کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ ایک زمانہ پہلے اُس کی اپنی ایک شناخت تھی اور اب بھی اگر چاہے تو حاصل کر سکتی ہے۔ دوئم، وہ آدی نارائن اور انیل کمار کے منہ بند کرنا چاہتی تھی جو اب ضرورت سے زیادہ کھلنے لگے تھے۔ سوئم، یہ (جسے سب سے پہلی وجہ ہونی چاہیے تھی) کہ اسکرین پر اپنا ماضی دیکھ کر اپنے دل کو تسلی دینا چاہتی تھی کہ وہ اب بھی خوبصورت، ذہین اور لاکھوں پرستاروں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔

وہ اپنے خیالات میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز بھی نہیں سن سکی البتہ جب اُس نے ایک اعلیٰ فوجی افسر کو آگے بڑھتے دیکھا تو سر جھٹک کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن آنے والے نے جس کا چہرہ وہ اندھیرے کے باعث پہچان نہیں پا رہی تھی اُسے ہاتھ



کے اشارے سے بیٹھے رہنے کو کہا اور اُس کو نے کی طرف بڑھ گیا جہاں گوتم نیلا مبر بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ اسکرین کی روشنی میں اُسے پہچان سکتی تھی۔ وہ میجر جعفر سنجانی تھا جو محل کے حفاظتی عملے کی سربراہی کرتا تھا۔

میجر سنجانی نے انگلیوں سے گوتم کے کندھے پر دستک سی دے کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور جھک کر اُس کے کان میں کچھ کہا۔ گوتم سرگوشی سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور کسی سے کچھ کہے بغیر باہر کی سمت چل دیا۔ میجر سنجانی اُس کے ساتھ تھا۔

شیتل نے نگاہیں دوبارہ اسکرین پر جمادیں لیکن اُس کا ذہن سنجانی اور گوتم میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ جب کئی منٹ تک اُن میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا تو وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گئی۔ اس بار اُس کی سوچوں کا محور رامیر تھا۔

رامیر کل واپس گھر آ رہا تھا۔

شیتل کو بتایا گیا تھا کہ شاہ کا خصوصی نجی طیارہ کل صبح ریال ایر پورٹ پر لینڈ کرے گا۔ شاہ کے وفد کے ایک رکن کرنل حجازی نے تمام افراد کو فون پر الرٹ رہنے کو کہا تھا جن میں لینڈنگ اسٹریپ کا کریو، محل کا اسٹاف اور خاندان کے افراد شامل تھے۔

اور پروجیکشن ہال کے اندھیرے میں بیٹھی شیتل خود کو اپنے شوہر سے ملاقات کے لیے تیار کر رہی تھی۔

اُس نے سوچا تھا کہ شاہ کا استقبال کرنے خود ایر پورٹ جائے گی۔ سینٹ موریز میں ہونے والے حادثے کے بعد یہ پہلا موقع ہوتا کہ وہ محل سے باہر اُسے خوش آمدید کہتی۔ اس طرح کے استقبال سے یقیناً رامیر کو بے حد خوشی اور آنے والے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے لیے انہونی بات ہوتی۔

شیتل نے فیصلہ کیا کہ وہ بھاگ کر اپنے شوہر کے گلے کا ہار ہو جائے گی اور پھر اُس کے بازو میں بازو ڈالے تہا شاہی بلٹ پروف لیموزین کی عقبی نشست پر بیٹھے گی۔ وہ تجویز پیش کرے گی کہ شاہی باڈی گارڈ شو فر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھیں اور پھر ساؤنڈ پروف گلاس پارٹیشن اٹھا دے گی جس سے وہ دونوں باقی دنیا سے کٹ جائیں گے۔ رامیر اُس سے بچوں، مہمانوں اور خیموں کے شہر کے بارے میں پوچھے گا۔ وہ خود اُس کے بارے میں بھی

پوچھے گا اور پھر وہ اُسے بتائے گی لیکن سب کچھ نہیں، صرف تھوڑا سا۔۔۔ اُسے گوتم کی طرف سے کان بھرے جانے کے لیے تیار کرے گی۔

اُسے اُس کے غصے سے خوف آتا تھا۔ وہ اُس کے بہت جلد مشتعل ہو جانے سے ڈرتی تھی۔ اس لیے وہ اُس سے محبت جتائے گی اور رات گئے تک اُسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی۔ پھر جب وہ دونوں محبتوں کے دیپ جلانے کے لیے اپنے کمرے میں ہوں گے تو موقع پا کر اُسے سب کچھ بتا دے گی۔

یہ سب انتہائی محتاط طریقے سے کیا جانا تھا۔ خوش قسمتی سے گوتم اُسے یہ بات بتا چکا تھا کہ رامیر کو اُس کی بہنئی واپسی کا خدشہ لاحق تھا اور اس نے اس کی عدم موجودگی میں اپنے دوست سے اس معاملے پر تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔

لیکن دستبرداری؟ اُسے علم تھا کہ جب وہ زبان سے یہ لفظ ادا کرے گی تو ایک دہشت ناک قسم کا سین رونما ہوگا لیکن اُس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگر رامیر نے کوئی سخت ردِ عمل ظاہر کیا تو وہ جو ملی تقریبات سے پہلے ہی غائب ہو جائے گی اور رامیر کو لوگوں سے یہ کہنے کے لیے تنہا چھوڑ دے گی کہ اُس کی بیوی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

عقبی دروازہ پھر کھلا اور بند ہوا۔ شیتل کی سوچیں بھٹم گئیں۔ اندر آنے والا گوتم نیلا مبر تھا جو اُس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”براہ کرم آپ تمام لوگ فلم دیکھیں میں ہر میچسٹی سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ گوتم نے باقی لوگوں سے معذرت کی اور شیتل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر کی جانب چل دیا۔ وہ خاصی جلدی میں لگ رہا تھا۔

جونہی وہ دروازے سے باہر نکلی یہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھیل گئیں کہ میجر سنجانی ایک ستون کا سہارا لیے سسکیاں لے رہا تھا۔ شیتل نے پلٹ کر گوتم کو دیکھا۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ محض پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ شیتل بری طرح خوف زدہ ہو گئی۔ اُس نے گوتم کو چشمہ اتارتے دیکھا اور ساتھ ہی گوتم کی آنکھیں آنسو اگلنے لگیں۔

”گوتم!“ شیتل ہسٹیر یاکی انداز میں چیخی۔ ”یہ سب کیا ہے؟ بتاؤ گوتم۔“ اُس نے بڑھ کر گوتم کے دونوں بازو تھام لیے اور اُسے تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔ ”کیا ہوا ہے گوتم؟“

گوتم نے جیب سے رومال نکال کر آنکھیں خشک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اُس کے مُنہ سے سکياں نکل رہی تھیں۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ کسی طرح اُس کی زبان سے محض چند ٹوٹے پھوٹے جملے ادا ہوئے۔

”رامیر کا انتقال ہو گیا ہے، شیتل۔۔۔ ایک حادثے میں۔۔۔ کار کا حادثہ۔۔۔ پیرس

میں۔۔۔۔“

شیتل لہرائی لیکن اس سے پہلے کہ اُس کا جسم پختہ فرش سے ٹکراتا۔ ہچکیاں اور سسکياں لیتے گوتم نے بڑھ کر اُسے تھام لیا۔ شیتل کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخی۔ ”یہ جھوٹ ہے، وہ کل صبح واپس آ رہا ہے۔۔۔ تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں۔۔۔“ شیتل نے بُری طرح بلکنا شروع کر دیا۔ ”میں اُس کے استقبال کے لیے خود اتر پورٹ جا رہی ہوں۔۔۔ ہم دونوں اکیلے پھیلی نشست پر بیٹھ کر محل واپس آئیں گے۔۔۔ میں اُس سے مستقبل کے منصوبوں پر بات چیت کروں گی۔۔۔“ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

جانے کتنی دیر وہ یونہی بلکتی رہی۔ گوتم یا میجر سخانی نے اُسے چُپ کرانے یا دلاسا دینے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ کافی دیر بعد جا کر اُس کی ہچکیاں کم ہوئیں لیکن آنسو بدستور اُمڈے چلے آ رہے تھے گوتم اس تمام عرصے میں اُسے سہارا دیے کھڑا رہا تھا۔

”اب تم کبھی اُس سے بات نہیں کر سکو گی۔“ شیتل کی حالت کچھ سنبھلنے پر گوتم نے کہا۔ ”رامیر ہماری دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔ یونٹ الیگزینڈر پر کار کا حادثہ ہوا ہے وہ خود ڈرائیو کرتے ہوئے نیوی ملی میں اپنے گھر واپس آ رہا تھا۔ رات دو بجے کا وقت تھا اور دھند۔۔۔ پورا پیرس دھند میں لپٹا ہوا تھا کہ۔۔۔“

”پیرس؟“ شیتل چوکی۔ ”وہ پیرس میں تھا؟ تمہیں کس نے بتا دیا ہے؟“

”صدر فرانس نے ایلیسی پیلس سے فون کیا تھا۔ حادثے کی اطلاع انہوں نے ہی دی ہے۔ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ تمام تحقیقات اور انتظامات ہنگامی اور اعلیٰ سطحی بنیادوں پر کیے جائیں گے۔“

”گوتم۔۔۔!“ اُس کی آواز ڈوب ابھر رہی تھی۔ ”کیا وہ کار میں تھا؟“

”اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”پڑتا ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ۔۔۔“

”گوتم!“ شیتل پوری قوت سے چیخی۔

”ہاں۔“ اُس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ”ایک فرانسیسی اداکارہ اُس کے ہمراہ تھی

لیکن وہ بچ گئی ہے اور اُسے غائب کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی اسکینڈل نہ بنے، صدر فرانس نے خود اُس اداکارہ سے بات کی ہے۔“

شیتل نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ سسکیاں اور ہچکیاں پھر بلند ہونے لگیں۔

”رامیر۔۔۔ کبھی نہیں مر سکتا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ کہہ دو۔۔۔“

جھوٹ ہے۔۔۔ بکواس ہے۔۔۔“ اُس پر مسٹر یائی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

اُس کا ذاتی ڈاکٹر رضا حسینی آ پہنچا تھا۔ اُس نے اپنے سلیپنگ سوٹ پر گاؤن پہن رکھا تھا جس کی ڈوریاں بھی صحیح طرح کسی ہوئی نہیں تھیں۔ اُس نے ایک سرخ اپنے بازو میں داخل ہوتے محسوس کی۔

”چھوڑ دو مجھے۔“ وہ بُری طرح دھاڑی۔ ”مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔۔۔“

میرے بچے۔۔۔“

”وہ سور ہے ہیں۔“ کسی نے جواب دیا۔ ”نرس نے تمام افراد کو ہدایت کر دی ہے کہ

کوئی اُن کے قریب نہ جائے۔ صبح ہم انہیں آپ تک لے آئیں گے۔“

”کریم۔۔۔ اریہ۔۔۔؟“

”ہم انہیں مطلع کر دیں گے۔“

”نہیں، میں خود انہیں بتاؤں گی۔“

”تھوڑی دیر بعد۔۔۔ انجکشن آپ کو نیند کے لیے نہیں دیا گیا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ

صرف سکون آور ہے، میں آپ کو ہوش و حواس سے بے گانہ ہونے کی اجازت نہیں دے

سکتا۔ پہلے آپ خود کو سنبھالیں اور اس حادثے کو بھولنے کی کوشش کریں۔“

”کبھی نہیں۔“ وہ دوبارہ چلائی۔ ”کبھی نہیں، مجھے میرا شوہر چاہیے۔“  
ڈاکٹر حسینی اُس کی طرف بڑھا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ اب یہ ناممکن ہے۔ میں آپ سے  
کچھ اور تو نہیں کہوں گا صرف ایک جملہ۔۔۔ کہ وقت دنیا کا سب سے بڑا مرہم ہے۔۔۔  
آپ ذرا دیر آرام کر لیں۔۔۔ آپ کہیں تو میں آپ کی ملازمہ کو بلوا بھیجوں۔“  
”نہیں۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”سلیٹی کو بلوا دیں۔“

سلمیٰ نے اُس کے ساتھ کیا کچھ کیا اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ وہ نیم خوابی کی کیفیت میں تھی، اور سلمیٰ بھی اُسے کسی دیو قامت سائے سے زیادہ کچھ نظر نہیں آ رہی تھی۔

سلمیٰ کی مدد سے ہی اُس نے ارون کو جگا کر حادثے کے بارے میں بتایا اور اُسے فوری طور پر سوئٹزر لینڈ جا کر کریم کو ساتھ لانے کے لیے کہا۔ ارون کی روانگی کے بعد اُس نے سوئٹزر لینڈ لی روزی فون کیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اُس کی درخواست پر کریم کو جگایا۔ وہ اپنے باپ کے انتقال کی خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُس نے اُسے بتایا کہ وہ تیار رہے۔ ارون اُسے لینے پہنچ رہا ہے۔

پیرس میں اریبہ کے فلیٹ پر فون، ریکس نے اٹھایا۔ اُس نے فون کی وجہ بتائی تو ریکس کو فوری طور پر یقین ہی نہیں آیا۔ اگلے ہی لمحے اریبہ خود لائن پر تھی۔

”اوہ نو۔“ وہ ہسک پڑی۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

لیکن یہی سچ تھا۔ اریبہ کی ہسکیاں، بچکیوں میں بدل گئیں تو ریکس نے ریسپور لے لیا۔

”میرے لائق کوئی خدمت؟“

”ایلیسی پپلس سے رابطہ کرو۔“ شیتل نے اُسے ہدایت کی۔ ”اریبہ کے لیے حکومت فرانس ٹھوسی طیارہ فراہم کر دے گی۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم اُس کے ساتھ مت آنا۔ میں فی الحال یہاں تمہارے تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتی۔“

پھر اُس نے عذرا کو فون کیا جس کے بارے میں کرنل نوری نے پتا چلایا کہ ان دنوں استنبول میں ہے۔

”میں پہلی دستیاب فلائٹ سے ریال پہنچ رہی ہوں۔“ شہزادی عذرانے جواب دیا۔

اور سب سے آخر میں لوزانے میں پتا کے گھر فون کی کھنٹی بجی۔ پتا خود فون پر تھی۔

”پیتا؟“ شیتل نے پکارا۔

”کون؟“ پیتا نے سوال کیا۔

”میں ریال سے شیتل بات کر رہی ہوں، کیا تم تنہا ہو؟“

”یور میجسٹی۔“ پیتا کا لہجہ فوراً بدل گیا۔ ”کیا آپ شاہ کے بارے میں دریافت کر رہی

ہیں۔ وہ یہاں نہیں۔۔۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”پھر کیوں۔۔۔؟“

”پیتا۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔ کیسے بتاؤں کہ رامیر کا۔۔۔ انتقال ہو گیا ہے۔“ شیتل کو

دی جانے والی دوا کا اثر زائل ہوتا جا رہا تھا اور اُس کی ہسٹیریا کی کیفیت لوٹ رہی تھی۔

پیتا اتنے زور سے چیخی کہ شیتل کو ہیڈ فون کان سے ہٹالینا پڑا۔ ”تم جھوٹ کہتی ہو، میری

سوچن ہوتا؟ تم مجھے دکھ دینا چاہتی ہو، تم۔۔۔“

”یہ سچ ہے پیتا۔“ شیتل نے اُس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ”میں بھی تمہاری طرح

اسی دکھ سے گزر رہی ہوں۔ میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ تم اُس سے پیار کرتی تھیں

اور میں نہیں چاہتی کہ تمہیں تمہارے محبوب کے مرنے کی خبر اخباروں سے ملے۔۔۔ یہ

حقیقت ہے پیتا۔۔۔ خدا گواہ۔۔۔“

ریسیور اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور اس نے سسکنا شروع کر دیا۔

شاید سلی نے ڈاکٹر حسینی کو بلا بھیجا تھا کیونکہ فوراً ہی اُسے بازو میں سرنج چھتی ہوئی

محسوس ہوئی اور وہ بے دم ہو کر بستر پر گر پڑی۔

بے ہوش وہ اب بھی نہیں تھی۔ بس سب کچھ اُسے خواب کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

ایک آدھ بار اُس نے بولنے کی کوشش کی لیکن ہونٹ محض تھر تھرا کر رہ گئے۔ اُس نے گوتم

نیلا مبر کو دیکھا، جنرل مجیب بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ جنرل کا چہرہ سو گوار تھا۔ اُس نے شیتل سے

تعزیت کی لیکن وہ جواباً اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔

پھر جنرل مجیب، گوتم کو کمرے کے کونے میں لے گیا۔ دونوں کچھ دیر سرگوشیوں میں

باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں گوتم نے ایک دوبار پلٹ کر حیرت زدہ نگاہوں سے شیتل کو

دیکھا اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔

”اوہ نہیں، یہ ناممکن ہے۔“ گوتم کی آواز شیتل کو کسی گہرے کنویں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

”یہ سچ ہے۔“ جزل عجیب نے جواب دیا۔ ”یہ دس سال قبل ہوا تھا۔ خود میں بھی بھول گیا تھا۔ شاہ کا خیال تھا کہ کریم کے سولہ سال کے ہوتے ہی وہ اسے منسوخ کر دیں گے۔“  
گوتم نے جواب میں کچھ کہا تھا لیکن شیتل کو سنائی نہیں دیا تھا۔



وہ لوگ کانفرنس روم میں موجود تھے۔ شیتل، سلمیٰ کے سہارے وہاں تک پہنچی تھی۔ سلمیٰ نے اُسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن شیتل کی ضد تھی کہ وہ اسی وقت جنرل مجیب اور گوتم سے بات کرے گی۔

”گوتم اور مجیب نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا اُن میں حیرت، دکھ اور صدمے کی سی کیفیت تھی۔“ شیتل نے سلمیٰ کو آگاہ کیا تھا۔ ”لیکن یہ رامیر کے انتقال کی وجہ سے نہیں تھا۔ وہ میرے بارے میں کوئی بات تھی، میں ہر حال میں ابھی اُن سے بات کروں گی۔“ اور سلمیٰ کو اُس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ دروازے پر پہنچ کر شیتل نے خود کو سلمیٰ کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ چند ثانیے وہ دیوار کا سہارا لیے ہانپتی رہی اور پھر بے آواز قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔

”پیارے دوستو!“ اُس نے کمزوری آواز میں کہا۔ ”کیا میں شامل ہو سکتی ہوں؟“

وہ تمام کے تمام یوں اچھلے جیسے انہیں بچھوؤں نے ڈنک مار دیا ہو۔

”شیتل۔“ انیل کمار اپنی جگہ سے اٹھ کر اُس کی طرف بڑھا۔

”میرے نزدیک مت آنا۔“ اُس نے حتی المقدور تیز آواز میں چیخ کر اُسے متنبہ کیا۔

”تمام لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھے رہیں تاکہ مجھے نظر آسکیں، شاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا تم

انقلاب کی منصوبہ بندی کر رہے ہو جنرل؟ اور یہ کیا تمہارے فوجی ہیں؟“

”تمہیں علم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وجیتا نے اپنی بھانجی کو ٹوکا۔ گیتا نے بھی اُس کی

ہاں میں ہاں ملائی۔

”سوری گیتا۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب تم سے نہ تھا۔ تمہاری اپنی

بادشاہت ہے، تمہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”یور میجسٹی۔“ جنرل مجیب نے نشست سے اٹھ کر اُسے تعظیم دی۔ ”اچھا ہوا آپ

یہاں تشریف لے آئیں۔ ہم ابھی آپ کو یاد کر رہے تھے۔ آپ کے موجودہ اسٹیشن پر غور کر رہے تھے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ تدفین تک انتظار کر لیا۔۔۔“

شیتل کی نگاہوں میں سختی عود کر آئی۔ ”ابھی۔۔۔“ اُس نے حکم دیا۔  
انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے کسی ترجمان کی تلاش ہو۔  
”یور میجسٹی۔۔۔“ بالآخر گوتم نے بات شروع کی۔

”یور میجسٹی۔۔۔؟ تمہاری طرف سے گوتم؟“ شیتل طنزیہ طور پر ہنسی۔ ”اس وقت تمہاری آستین میں کون سا سانپ ہے؟“

”میری طرف سے کوئی نہیں۔“ گوتم نے اُس کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ ”مجھے جنرل مجیب نے کچھ باتیں بتائی ہیں جو دس سال قبل شاہ مرحوم نے طے کی تھیں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اُن کے انتقال سے بحریت زبردست دباؤ کا شکار ہے۔ بایاں بازو سر اُبھار رہا ہے اور بحریت خانہ جنگی کا شکار ہونے والا ہے۔ شاہ، ان عناصر کو کچل کر رکھتے تھے اور اسی لیے اُن کی خواہش تھی کہ وہ آپ کے آبائی وطن سے روابطِ دوستانہ رکھیں۔ انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ اُن کے انتقال کی صورت میں۔۔۔ ولی عہد کے بجائے۔۔۔ آپ بحریت کے تخت پر بیٹھیں گی۔ شاہ نے کہا تھا کہ میرے ارد گرد جو لوگ موجود ہیں اُن میں تخت پر بیٹھنے کے لائق ملکہ سے زیادہ بہتر کوئی شخص نہیں۔“

”لیکن اس کا۔۔۔“

”ایک منٹ یور میجسٹی، یہ کچھ عرصے کے لیے ہوتا اور پھر تخت ولی عہد کے سپرد کر دیا

جاتا۔“

”یہ تو میری بھی خواہش تھی۔ ہم دونوں ہی اس بات پر رضامند تھے کہ۔۔۔“

”گستاخی معاف ملکہ عالیہ۔“ جنرل مجیب نے دخل اندازی کی۔ ”شہزادہ کریم ابھی

تخت کی بھاری ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے خاصے کم سن ہیں۔ اس وقت بحریت کو آپ کی ضرورت ہے۔ ذاتی طور پر میں خود مرد ولی عہد کا حامی ہوں لیکن حالات کو بھی سامنے رکھیے۔ مناسب وقت آنے پر آپ تخت، ولی عہد کے حوالے کرنے کا اعلان کر سکتی ہیں۔“

شیتل کی آنکھوں کے سامنے پھر اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سری نگر

کے ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور کی بیٹی کسی طاقت ور ملک کی تقدیر کی وارث بن جائے گی۔  
اُس کا دماغ اُس کے کنٹرول سے باہر ہو رہا تھا۔ دور کہیں سے اُسے گوتم کی آواز سنائی دے  
رہی تھی۔

”شیتل۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بحریت تمہارا ہے، ہر شہری تمہارے حکم کا غلام ہے۔ مسلح  
افواج، پولیس، بے شمار دولت اور تخت کی طاقت و قوت سب تمہاری ہے۔ تم اب کسی ملک  
کے بادشاہ سے شادی کے رشتے سے ملکہ نہیں رہیں بلکہ آج سے تم بحریت کی حکمران ہو، آج  
شب سے تم حقیقی ملکہ بن گئی ہو۔“

ڈاکٹر ساری رات شیتل کے سر ہانے بیٹھا رہا تھا۔ وہ ایک آدھ بار سلمیٰ سے الجھا بھی تھا جو اپنی محبت میں اُسے لائے سیدھے مشورے دے رہی تھی۔ صبح تک شیتل کی حالت خاصی سنبھل گئی تھی۔

سب سے پہلے اُس کی ملاقات بچوں سے ہوئی جو اُچھلتے کودتے اور ماں سے غیر متوقع ملاقات کی خوشی میں گنگنا تے اور ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے لیکن جب شیتل نے انہیں اُن کے باپ کے انتقال کی خبر سنائی تو اُن کے قہقہے، آہوں اور ریسکیوں میں بدل گئے تھے۔ شیتل نے ایک ذمے دار بیوی اور پیار کرنے والی ماں کی طرح انہیں تسلی دی۔

”میرے پیارو۔“ اُس نے شہزادہ جنید اور شہزادی نریام کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ ”تم نے مقدس قرآن حکیم میں پڑھا ہوگا کہ ہماری زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم زمین پر اُس کی امانت ہیں اور وہ جب چاہتا ہے اپنی امانت واپس لے لیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یومِ حساب کا وعدہ بھی کیا ہے، جب تمام مرنے والے زندہ ہو جائیں گے۔ تمہارے والد کو بھی اٹھایا جائے گا اور زندہ کیا جائے گا اور اُس وقت تم اُن سے دوبارہ مل سکو گے۔“

شیتل بہت دیر تک انہیں اپنی آغوش میں لیے تسلیاں اور دلا سے دیتی رہی لیکن وہ جب کمرے سے رخصت ہوئے، تب بھی رو رہے تھے۔

”میں اب کسی سے نہیں ملوں گی۔“ بچوں کے جاتے ہی شیتل نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔  
 ”بد قسمتی سے یہ ممکن نہیں ہے ملکہ عالیہ۔“ ڈاکٹر نے ادب سے جواب دیا۔ ”جنرل مجیب اور ڈاکٹر گوتم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت روکا ہے مگر وہ بضد ہیں کہ یہ ملکی سلامتی کا معاملہ ہے۔“

دونوں سر جھکائے باادب اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ شیتل اُن سے نہیں ملنا چاہتی تھی لیکن مجبوراً اُسے بلا پڑا تھا۔ چند ثانیے وہ اُن کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن جب وہ خاموش رہے تو اُس نے خود ہی بات شروع کی۔

”میں پہلے ہی دُکھی ہوں، تمہید کی ضرورت نہیں جو کہنا ہے کہ۔۔۔ فوراً چلے جاؤ۔“  
 ”یور میجسٹی!“ جنرل عجیب کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ ”بے شک ہمیں بھی بے حد دُکھ ہے لیکن بعض معاملات آپ کی فوری توجہ کے طالب ہیں۔“

”ہمیں دخل اندازی پر افسوس ہے ملکہ عالیہ۔“ اس بار گوتم نے لب کشائی کی۔  
 ”لیکن بہت سے معاملات آپ کے احکامات کے منتظر ہیں۔ سرکاری اعلان، تدفین کے انتظامات، جو بلی تقریبات کی منسوخی۔۔۔ یہ فیصلے لازمی کیے جانے ہیں۔“

”تو کرگزرو۔“ شیتل نے بے زاری سے کہا۔ ”تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔“  
 ”آپ کی تاجپوشی سب سے اہم مسئلہ ہے۔“ گوتم نے جواب دیا۔ ”جو آپ کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ کو عوام کے سامنے جانا۔۔۔“

”میں ابھی اس کے لیے تیار نہیں۔“  
 گوتم اور جنرل عجیب کے مابین نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ بالآخر جنرل عجیب نے جواب دیا۔ ”تاجپوشی آپ کی صحت یابی تک

ملتی کی جاسکتی ہے۔ ابھی۔۔۔“  
 ”تو یہ طے رہا۔“ شیتل نے اُس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ”فی الوقت تاجپوشی نہیں ہوگی۔ اُس وقت تک جب تک میں اس بارے میں فیصلہ نہیں کرتی۔ باقی معاملات میں تم دونوں پر چھوڑتی ہوں۔“

رامیر کی آخری رسومات میں جو بلی تقریبات میں متوقع طور پر شریک ہونے والوں سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں معزز مہمانوں نے شرکت کی۔ تمام سربراہان، شاہوں، ملکائوں اور وفود کے قائدین نے فردا فردا شیتل سے ملاقات کر کے اظہارِ تعزیت کیا۔ رامیر کا آخری دیدار صرف خاندان کے افراد نے کیا اور پھر اُسے محل کی مسجد کے سائے اور اپنے والد کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

تدفین کے بعد قریبی رشتے داروں نے شیتل سے ملاقات کی۔ سب سے پہلے شہزادی عذرا آنسوؤں میں ترچہ لیے آئی۔ پھر شہزادی اریبہ زاہدی نے اپنی ماں سے تعزیت کی۔

”میرے لائق کوئی خدمت، آنٹی؟“ اریبہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ شیتل نے اسے کھینچ کر خود سے لپٹا لیا۔ ”پیرس واپس جا کر اپنی تعلیم مکمل کرو، جب مجھے تمہاری ضرورت ہوگی میں تمہیں سب سے پہلے بلاؤں گی۔“

انیل کمار اور آدی نارائن بھی آئے تھے۔ دونوں ہی اُس کا دکھ بانٹنے کے لیے فی الحال ریال میں رکنا چاہتے تھے۔ شیتل خاموش رہی اور وہ اپنی پیش کش کا جواب لیے بغیر ہی واپس چلے گئے۔

وجیتا اور سوہن کلکرنی نے بھی اُس سے ہمدردی ظاہر کی اور اُسے باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اُن کا خون ہے اور خون، پانی سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے۔ شیتل نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور جلد ہی دوبارہ بلانے کے وعدے کے ساتھ انہیں فوری طور پر واپس دہلی چلے جانے کی ہدایت کی۔

اُس نے گوتم اور گیتا سے بھی ملاقات کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کی خواہش تھی کہ سلسلی کے سوا سب لوگ واپس چلے جائیں۔ لیکن بہت سے لوگوں کو وہ اپنے منہ سے یہ نہ کہہ سکی تھی۔

اگلے چند ہفتے اُس کے لیے خاصے کر بناک اور باعثِ اطمینان رہے۔ کر بناک یوں تھے کہ اُس پر ذمے داریوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔ رامیر کے جرائم خاصے زیادہ تھے لیکن وہ اُن کی ذمہ دار نہ تھی۔ اُس نے خود کو بہت تسلیاں دیں اور بالآخر وہ اس بات کا اعتبار کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔

یہ وقت اُس کے لیے باعثِ اطمینان یوں تھا کہ اب وہ آزاد تھی۔ اُس نے اپنی آزادی اور مستقبل کے تحفظ کے لیے جنگ لڑی تھی۔ اب وہ ہر فیصلہ کرنے کے لیے آزاد تھی۔ رامیر کی شکل میں جو دیوار اُس کی راہ میں حائل تھی، اب ہٹ گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تو بحریت میں قیام کرتی اور اگر چاہتی تو بسبئی جا کر دوبارہ اداکارہ بن جاتی۔

رات کے دو بجے تھے اور سلمیٰ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی اخبارات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ وہ جب بھی پہلو بدلتی گری بے چاری یوں چرچاتی جیسے کسی ہاتھی کے نیچے آگئی ہو۔ اچانک قریب رکھا فون بج اٹھا۔ سلمیٰ نے حیرت سے پہلے دیوار گیر گھڑی دیکھی اور پھر ریسور اٹھا لیا۔

”مس سلمیٰ فاروق۔“ محل کے آپریٹر کی آواز سنائی دی ”اس وقت زحمت پر معذرت لیکن دہلی سے کوئی مسٹر جگد یپ موہن ہنگامی طور پر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”ملاؤ۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔ جگد یپ موہن، آکاش اسٹوڈیوز کے شیئر ہولڈرز اور مالکانہ فرم دہلی کنفری کلب کا چیف فنانس ڈائریکٹر تھا۔

”سلمیٰ؟“ جگد یپ کی کھر کھراتی آواز اُسے سنائی دی۔ ”میں ابھی اسکرین روم سے آیا۔۔۔“ اُس نے کسی تمہید یا سلام دعا کا تکلف نہیں کیا تھا۔

”مسٹر جگد یپ!“ سلمیٰ نے اُسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ یہاں اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں اور دوسری بات کہ وہاں کون سی قیامت آگئی ہے جو میری واپسی تک ٹل نہیں سکتی تھی۔“

”سوری سلمیٰ۔“ جگد یپ نے فوراً معذرت کی۔ ”یہاں رات کے آٹھ بجے ہیں۔“

”چلو کہہ ڈالو۔“ سلمیٰ نے برہمی سے کہا۔

”میں نے قاہرہ سے آنے والے رش پرنٹ دیکھے ہیں۔“ جگد یپ نے بات دوبارہ شروع کی۔ ”فاروق، فلم کا بیڑہ غرق کر رہا ہے۔ تم فوری طور پر قاہرہ پہنچو اور جو مناسب سمجھو کرو حتیٰ کہ دوبارہ شوٹنگ بھی کرائی پڑے تو پروا مت کرنا۔“

”اس کے علاوہ؟“

”اگر فاروق تمہاری توقعات پر پورا نہیں اتر رہا تو بے شک اُسے تبدیل کر دینا۔“



”میں فیصلے سے متفق ہوں۔“ سلمیٰ نے فوری طور پر ریسپورکھ دیا۔ اپنے شوہر کے خلاف فیصلہ کرتے ہوئے اُسے بے حد دکھ تھا لیکن اپنا مستقبل بچانے کے لیے فاروق کا مستقبل قربان کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

oo

”تو تم جارہی ہو؟“ شیتل نے ناشتے کی میز پر سلٹی کی پوری کہانی سن کر پوچھا۔ ”کیا واپس آؤ گی؟“

”میری ضرورت ہے؟“ سلٹی نے دریافت کیا۔

”میرے خیال میں۔“ شیتل نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ”میں روز بہ روز پریشان ہوتی اور اب بھتی جارہی ہوں۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ میں بہادر ہوں لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ میں ایک اداکارہ ہوں۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“

”مجیب، گوتم، کرنل ایمینی، وزیر داخلہ، اُن کا کہنا ہے کہ یہ وقت، میرے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا ہے۔ لوگ بے چین اور بے سکون ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملکہ اُن کے سامنے آئے، ٹی وی پر یا کسی جلسے میں۔۔۔ تاکہ کسی طور تو اندازہ ہو کہ بحریہ حکمران کے بغیر نہیں ہے۔ بہت سی دستاویزات میرے دستخطوں کی منتظر ہیں، بہت سے اجلاس التوا کا شکار ہیں، جنہیں اب مزید ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔ صرف تم اور اردن میری پوزیشن سمجھ سکتے ہو۔۔۔ میں اب حکمران ملکہ ہوں، تین کروڑ عوام کی ملکہ، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔“

”فکر نہ کرو۔“ سلٹی نے اپنی سہیلی کو تسلی دی۔ ”میں اپنے مسائل حل کر کے جلد از جلد لوٹ آؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ اُس وقت تک تم یہ فیصلہ کر چکی ہو گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟“

اُس کے اعصاب تناؤ اور کشیدگی کا شکار تھے۔ آج اُسے گولڈن لائن روم میں تنہا داخل ہونا تھا۔

جب سنہری شیر والا یہ کمرہ، رامیر کا دفتر تھا تو اُسے شاذ شاذ ہی اندر داخل ہونے کی اجازت ملتی تھی کیونکہ یہی وہ کمرہ تھا جہاں سے وہ فوجی افسران اور ملکی و غیر ملکی مشیروں کے جلو میں بحریت پر حکمرانی کرتا تھا۔ اور اب یہ کمرہ اُس کا تھا۔

دربان نے اُسے دیکھتے ہی لکڑی کا بھاری بھر کم دروازہ کھول دیا اور وہ لرزے ڈمگاتے قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جس کے آخری سرے پر عظیم الشان میز اور گرسی رکھی تھی۔ اندر داخل ہونے والا میز تک پہنچنے تک ہی کئی مرتبہ ڈوب کر اُبھرتا اور اُبھر کر ڈوبتا تھا۔ خود شیتل کی بھی اِس وقت یہی کیفیت تھی لیکن اِس وقت اُس کی اِس کیفیت کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

اُسے اِس کمرے میں ارون سے ہونے والی پہلی ملاقات یاد آئی۔ اُس وقت رامیر اپنی تخت نما گرسی پر براجمان تھا اور شیتل اُس کے پہلو میں تھی۔ اُس دن کے بعد سے شیتل آج پہلی بار شاہی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن اب رامیر جاچکا تھا اور گرسی خالی تھی۔

وہ آہستگی سے گرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے جسم میں ایک نئی طاقت عود کر آئی تھی۔ وہ آج شاہ بحریت کی بیوی کی حیثیت سے نہیں ملکہ بحریت کی حیثیت سے یہاں بیٹھی تھی۔

جنرل مجیب، گوتم نیلامبر، آدی نارائن اور انیل کمار نے اُس کے ساتھ آنے پر اصرار کیا تھا لیکن اُس نے انکار کر دیا تھا جب کہ وجہیتا اور سوہن اُس کے یہاں آنے سے پہلے ہی بھارت روانہ ہو چکے تھے۔

”دنیا کے ہر ملک سے تعزیتی پیغامات آئے ہیں، ملکہ عالیہ“ گوتم نے اُسے آگاہ کیا تھا۔ ”میرے خیال میں انہیں فریدہ کے حوالے کر دیں، وہ لن سے نمٹ لے گی۔ وہ رامیر کے بعد آپ کی بھی بہترین سیکرٹری ثابت ہوگی۔“

اُس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور اُسے باہر چھوڑ کر اندر آگئی تھی۔  
گُرسی پر بیٹھ کر اُس نے کمرے کا جائزہ لیا، ہر شے سے امارت اور شہنشاہیت ٹپکتی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ اُس نے کئی بار رامیر سے وزراتی کونسل کے اجلاس میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کی لیکن اُس نے بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔

”تمہارا مقام یہ نہیں۔“ ایک بار رامیر نے کہا۔ ”یہاں کے معاملات بے حد پیچیدہ اور گنجک ہوتے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہوتا اور ہمیں بڑے عجیب و غریب فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔“

”آپ نے مجھے معززین کی بیگمات کے ساتھ چائے پینے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔“ اُس نے احتجاج کیا تھا۔ ”میں صرف پلوں اور سڑکوں کے افتتاحی ربن کاٹتی پھر رہی ہوں جب کہ آپ جانتے ہیں کہ میں ان سے کہیں زیادہ ذمے داریاں انجام دینے کے قابل ہوں۔“

”شاید کبھی مستقبل میں ایسا ہو۔“ رامیر نے جواب دیا تھا۔

اور اب وہ مستقبل اُس کے قدموں کے نیچے تھا۔

اُس نے اپنا سیاہ چشمہ اتار کر ایک طرف رکھا اور میز پر پڑے کاغذات کے پلندے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ سب سے اوپر ریال میں ایک پبلک پارک کی تعمیر کا مالی تخمینہ رکھا ہوا تھا جس کے نیچوں بیچ رامیر کا ایک دیو قامت مجسمہ نصب کرنے کی تجویز تھی۔ اُس نے کچھ دیر ہندسوں میں سرکھپایا لیکن پھر اُس رپورٹ کو ایک طرف ڈال دیا۔

اُس کے نیچے والی فائل پر ارجنٹ لکھا ہوا تھا اور یہ ریال کے مضافات میں کاروں اور ٹرکوں کے فاضل پُرزدوں کی تیاری کے کارخانے کی مالیاتی رپورٹ تھی۔ وہ بھی پہلے والی رپورٹ کی طرح پریشان کن تھی۔

تیسری فائل پر بھارت کے محکمہ دفاع کا مخصوص نشان بنا ہوا تھا اور اس میں ٹائپ کیے

ہوئے سات صفحے لگے ہوئے تھے اُس نے کچھ دیر اُسے دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا۔  
ایک ایک کر کے وہ بالآخر نیچے تک جا پہنچی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ جو کچھ اُس نے پڑھا  
ہے انہیں سمجھے بھی لیکن جب اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اُس نے ایک ایک کر کے تمام  
کاغذات پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

oo

ارون کپڑے کا بیج سے رخصت ہونے سے قبل آئینے میں آخری بار اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس نے اسکول کا مخصوص یونیفارم اتار پھینکا تھا اور اب وہ باہر جاتے ہوئے روزانہ نیا سوٹ استعمال کرتا تھا۔

ایک ہفتہ قبل شیتل نے رامیر کے سابق پریس سیکرٹری جو ایک فوجی کرنل تھا، کی جگہ اُس سے یہ عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی تھی۔

”پلیز! ارون انکار نہ کرنا۔“ شیتل نے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔ ”مجھے اپنے ترجمان کے لیے کسی بااعتماد آدمی کی ضرورت ہے۔ تمہارا ماتحت بینکن، اسکول کا چارج سنبھال لے گا۔“

اور وہ رضامند ہو گیا تھا۔

آج کا بیج سے رخصت ہوتے ہوئے وہ خود کو خاصا بے وقوف محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے شیتل کو ایک قبائلی پہاڑی گاؤں کے سردار خامی تہرانی سے ملاقات پر رضامند کیا تھا اور اب ذرا دیر بعد وہ بوڑھا سردار پہنچنے والا تھا۔ ارون کو یقین تھا کہ وہ اپنے قومی لباس میں ہی آئے گا اور اُسے یعنی ارون کو جو اس وقت بہترین تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا، گولڈن لائن روم تک سردار کی رہنمائی کرنی تھی۔

پہلے پہل شیتل نے قبائلی سردار سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ارون نے بڑی مشکل سے اُسے راضی کیا تھا۔

”اُس کے لوگ گندے اور غریب ہیں۔“ ارون نے اُسے بتایا تھا۔ ”دوسرے دیہات کے سردار اُس کی سربراہی میں ایک اتحاد قائم کر رہے ہیں جو آگے چل کر تمہارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس وقت تہرانی سے ملاقات بنگم پریس کے دورے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔“

”میں پہلے ہی بہت سے مسائل میں گھری ہوئی ہوں۔“ شیتل نے اُسے یاد دلایا تھا۔ ”میں انہی سے عہدہ برآ نہیں ہو پا رہی اور تم ایک اور بلا مجھ پر مسلط کر رہے ہو، میں بھلا اُس کی کس طرح مدد کر سکتی ہوں؟“

”میں تم سے اُس کی مدد کرنے کو نہیں، صرف ملنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“

ارون نے ملکہ اور قبائلی سردار کا تعارف کرایا اور پروٹوکول کے مطابق کمرے سے باہر چلا گیا۔

نرم و نازک شیتل کے مقابل تہرانی کسی دیو سے کم نہ تھا۔ اُس کی لمبی داڑھی اور چہرہ چوڑا چمکا تھا جس کے گرد اُس نے ایک چادر لپیٹ رکھی تھی۔ سر پر نیلی پگڑی اور جسم پر نہایت خستہ اور مٹی میں اٹا ہوا لباس تھا۔ ارون دروازہ بند کر کے باہر نکلا تو شیتل کمرے میں تنہا ہونے کے باعث گھبرا گئی۔ اس نے دوبارہ بلانے کے لیے بزرگی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن کچھ سوچ کر رک گئی۔

”میرا خلیہ آپ کو ناگوار گزارا ہوگا۔“ تہرانی نے کہا اُس کے بچنے کی مناسبت سے آواز حیرت انگیز طور پر نرم تھی۔ ”فلموں کے ویلن یقیناً میرے جیسے ہوتے ہوں گے لیکن آپ کو مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں ایک دوست کی حیثیت سے آیا ہوں۔“

شرمندہ سی ہو کر اُس نے اپنی گرسی سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ”ہم برابری کی بنیاد پر مل رہے ہیں، سردار۔“ اُس نے اپنی نفرتی گھٹنیوں کی سی آواز میں کہا۔ ”تشریف رکھیں، میں اس چھوٹی سی گرسی کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن اگلی بار جب آپ آئیں۔۔۔۔۔“

”اگر میں دوبارہ آیا تو۔۔۔۔۔“

”آپ کو یقین نہیں کیا؟“

”شاید۔“ سردار نے جواب دیا۔ ”آپ نے میرے برابر ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کا انحصار ہمارے تعلقات کی آئندہ نوعیت اور آپ کے خُسنِ سلوک پر ہے۔“

”میں آپ کے مسائل سننا چاہتی ہوں۔“

”میں نے سالوں آپ کے شوہر سے ملنے کے جتن کیے لیکن آج پہلی بار یہاں تک



رسائی ہو سکی ہے۔ انہوں نے مجھے کچلنے کے لیے ایسے راستے اختیار کیے جو سراسر کمینگی کے مترادف تھے۔“

”کمینگی؟“ شیتل تقریباً چلا اٹھی۔ ”میں اعتراف کرتی ہوں کہ بہت سے لوگوں کو میرے شوہر سے انصاف نہیں ملا لیکن آپ کو علم ہونا چاہیے کہ پوری قوم نے اُن کا سوگ منایا، اُن کے جنازے میں ہزاروں افراد شریک تھے۔ میں نے خود بحریت کے طول و عرض کا دورہ کیا اور مجھے ہر جگہ لوگوں نے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا، کیا کسی کمینہ خصلت حکمران کے مرنے پر سوگ کا یہ انداز ہوتا ہے؟“

”میں معافی چاہتا ہوں، میڈم لیکن ریال، بحریت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جب کہ ملک کے دوسرے حصوں کے دوروں کا اہتمام باقاعدہ منصوبہ بندی سے کیا گیا ہوگا میں آپ کو اپنے گاؤں آنے کی دعوت دیتا ہوں پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کے ملک میں کتنے انسان، کتوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔“

”لیکن انہوں نے احتجاج کیوں نہیں کیا؟“

”اپنی زندگی تو جیونی کو بھی عزیز ہوتی ہے ملکہ۔“ سردار نے طنزیہ طور پر کہا۔ ”کسی کو آپ کے شوہر کی تنگ و تاریک جیلوں میں یا اُن کے پلے ہوئے غنڈوں کے ہاتھوں گولی کھا کر مرنے کا کوئی شوق نہیں تھا اور ہاں آپ یہ بھی سن لیں کہ میں اب ان غریبوں کے لیے آپ سے کسی مدد کی اپیل کرنے نہیں آیا بلکہ آپ کی زندگی بچانے آیا ہوں میڈم، میں آپ کو متنبہ کر رہا ہوں کہ اگر آپ نے ظلم و بربریت، رشوت و اقربا پروری اور حق تلفی و نا انصافی کا خاتمہ نہ کیا تو آپ کا انجام بھی اپنے شوہر سے مختلف نہ ہوگا۔“

”ممکن ہے میرے شوہر کو اس کا علم ہی نہ ہو۔“ شیتل نے کمزوری آواز میں صفائی پیش کی۔ ”آپ کا کہنا ہے کہ آپ نے اُن سے کبھی ملاقات نہیں کی۔“

”وہ سب کچھ جانتے تھے، ملکہ، اُن کی خفیہ پولیس انہیں پل پل کی خبریں دیتی تھی۔ وہ پہلے اُن کی ملکیت تھی اور اب آپ کے تصرف میں ہے۔“

”پولیس نے مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔“ شیتل نے کہا۔ ”آپ کچھ روشنی ڈالیں۔“

”جنرل مجیب سے پوچھ لیں، وہ آپ کو بتا دیں گے کہ شاہ، بحریت کو امریکہ اور سوویت یونین جیسی فوجی قوت بنانا چاہتے تھے اور یہ مقصد عرصہ دراز پہلے حاصل کیا جا چکا ہے۔“

”ناممکن، آج مجھے فوجی ہتھیاروں کی خریداری کا صرف ایک بل پیش کیا گیا ہے۔“  
 ”کیا آپ نے اُس پر دستخط کر دیے؟“  
 ”نہیں۔“

”گڈ، تو اس کا مطلب ہوا کہ مجھے تاخیر نہیں ہوئی۔“  
 ”کس چیز کے لیے تاخیر نہیں ہوئی؟“

”مزید فوجی ہتھیاروں کی خریداری کے جرم میں ملوث ہونے سے روکنے کے لیے۔“  
 ”مزید فوجی اخراجات؟ مجھے کیسے علم ہوگا کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“  
 ”ڈاکٹر گوتم نیلامبر سے پوچھ لیں۔“

”گوتم؟“ شیتل نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ اس سلسلے میں مجھے کیا بتائے گا؟“  
 ”وہ سب جانتا ہے، میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں، آپ کی اور اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے۔۔۔۔۔“

”ہمارا مستقبل ہمارے پیچھے رہ گیا ہے، بوڑھے لڑکے۔“ آدی نارائن نے طنزاً انیل کمار کو کہا، وہ ابھی ابھی اپنا سامان باندھ کر فارغ ہوا تھا۔ ”میں نے شیتل کو خدا حافظ کہہ دیا ہے۔ اُسے بتا دینا کہ وہ جب بھی بمبئی آنے کا فیصلہ کرے میرے دروازے اُسے ہمیشہ کھلے ملیں گے، کل میں حقیقتوں کی دُنیا میں واپس جا رہا ہوں، تم چاہو تو اس بار کھڑکی کی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہو۔“

”ہو سکتا ہے میں ابھی نہ جاسکوں۔“

آدی نارائن نے ایک طویل سانس لی۔ ”اب تم آستین سے کیا نکالنا چاہتے ہو؟“

”شیتل نے مجھے اپنے ذاتی کمرے میں چائے پر بلایا ہے۔“

”اور اُس کی پٹاری میں کیا ہے؟“

انیل نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”بعد میں بتاؤں گا، گزرنے والے حسین لمحوں کی پوری

تفصیلات کے ساتھ۔“

شیتل نے خلاف توقع خود اُس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن یہ ملاقات اُس کے دفتر یا کسی عام کمرے میں نہیں بلکہ منسلکہ کے ذاتی اپارٹمنٹ میں ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی ذاتی اور بااعتماد ملازمہ نیریت کے ذریعے پیغام بھیجا تھا کہ وہ شام 5 بجے اپنے کمرے میں چائے پر اُس کا انتظار کرے گی۔

بنے ٹھنڈے انیل کی دستک کے جواب میں دروازہ خود شیتل نے کھولا لیکن جب وہ اندر داخل ہوا تو اُس کی کوئی ملازمہ نظر آئی نہ چائے۔ ابھی وہ اپنی حیرت پر ہی قابو نہ پاسکا تھا کہ شیتل نے اُسے خود سے قریب بیٹھنے کی دعوت دے کر مزید حیرت زدہ کر دیا۔ اُس نے تعمیل تو کی لیکن بڑے محتاط انداز میں، انداز ایسا ہی تھا جیسے ابھی اُٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگا دے گا۔

”اُٹو!“ شیتل کی آواز، اُسے پچھو کا ڈنک محسوس ہوئی اُس نے پندرہ سال بعد اُسے اس نام سے پکارا تھا جس نام سے وہ بمبئی میں اُسے پکارا کرتی تھی۔ ”اک نمبر محبت، پرانے وقتوں کے نام۔۔۔“

انیل نے کسی احتجاج یا حیرت کے بغیر حکم کی تعمیل کی اور پھر وہ سب کچھ کرتا چلا گیا جو شیتل اُسے کہتی گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ طوفانی موبیس، بڑے سکون لہروں میں تبدیل ہوتیں شیتل دُور ہٹ گئی۔

”تم نے مجھے بمبئی سے کیوں بلایا تھا؟“ انیل نے جو پوچھا سو سوال کیا۔

”ان لمحوں کے لیے نہیں جو ابھی گزرے ہیں۔“ شیتل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہ سب اُس وقت رونما ہوا جب مجھے یقین ہو گیا کہ ایک بار پھر تم مجھے تباہ کرنے پر ٹل گئے ہو۔ تمہارے بلانے کے مقاصد کچھ اور تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہیں بہت سزا مل چکی ہے اور اب تمہیں ایک موقع اور دینا چاہیے، مجھے امید تھی کہ ہم دونوں بہتر انداز میں واپس آ سکتے

ہیں۔“

”واپسی؟“ ائیل نے حیرت اور غصے کے ملے جلے انداز میں کہا۔ ”میں کبھی اس شعبے سے دور نہیں رہا۔“

”ہاں، گتوں کو کھلائے جانے والے راسخے کے اشتہاروں کے ماڈل کے طور پر تم نے خوب نام کمایا ہے، کیا تم اسے کیرئیر کہتے ہو؟ میں فلموں کی بات کر رہی ہوں۔“

”کمرشل فلمیں کرنا کوئی عیب نہیں، دلیپ کمار تک نے اشتہارات میں کام کیا ہے، رہ گئی فلموں کی بات تو تم جانتی ہو کہ آج کل یہ کاروبار ویسے ہی مندا جا رہا ہے۔“

”لیکن دلیپ، دھر میندر، راجیش اور جینندر کے لیے نہیں۔“ شیتل نے طنز اُکھا۔ ”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔“ اُس نے صوفے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”پندرہ سال گزر گئے میری اور تمہاری محبت کو، اب تو میں نے اپنی زندگی کے اس باب کو ہی بھلا دیا ہے لیکن ان دنوں میں چاہتی تھی کہ ماضی کو آواز دوں۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری بھی یہی خواہش ہوگی۔ میں نے تم سے محبت کرنا تو عرصہ دراز پہلے چھوڑ دیا تھا لیکن یہ کبھی نہ بھلا سکی کہ تم نے کس بے دردی سے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا اور پھر کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔۔۔“

”تم ٹھیک تو تھیں؟“

”ہاں، میرے دوست، میں رامیر سے ملی اور اُس سے محبت کرنے لگ گئی لیکن تم اپنا نشان چھوڑ گئے۔ سو کچھ عرصے کے بعد میں نے اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کی ٹھانی۔“

”مجھ سے؟“

”ہاں، تم سے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمہیں دوبارہ دیکھ کر احساس ہوا کہ تمہیں مجھ پر ظلم ہونے کا کوئی احساس نہیں۔۔۔ تم سے ناتا ٹوٹنے اور رامیر سے شادی کے بعد کچھ عرصہ میں بہت آپ سیٹ رہی، پرانے دن مجھے رُلاتے رہے لیکن سلی نے جو ہر قدم پر میری دمساز اور نمکسار رہی، میری بربادیوں کا بدلہ لینے کا بیڑا اٹھایا اور تمہارے کیرئیر پر کام شروع کیا اور اُس کا منصوبہ بے حد کامیاب رہا۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”تمہیں خود کو بلیک لسٹ ہونا یاد نہیں، انیل۔“ شیتل نے قہقہہ لگایا۔ ”شروع میں اُس کا چونکہ اپنا کوئی مقام نہیں تھا اس لیے وہ کامیاب نہ ہو سکی لیکن جب وہ خود آکاش اسٹوڈیوز کی سربراہ بن گئی تو اُس نے نہ صرف اپنی فلموں بلکہ پوری بھارتی فلم انڈسٹری سے تمہیں دودھ میں سے گھسن کی طرح نکال پھینکا، اور یوں انیل کی کامیابیوں کا سورج مسلسل ڈوبتا چلا گیا۔“

انیل اپنی جگہ سے اٹھ کر شیتل کی طرف بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اُس کا ہاتھ شیتل کے نرم و نازک گال پر اپنا نشان چھوڑ جاتا وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔

”یہیں رُک جاؤ انیل، اب میں وہ شیتل کلکرنی نہیں ہوں جسے تم نے استعمال شدہ موزوں کی طرح پاؤں سے اتار کر کچرے کے ڈھیر پر ڈال دیا تھا۔ اب میں شیتل رامیر ہوں، تین کروڑ عوام کی ملکہ، میں چاہوں تو اپنی جانب اٹھا ہوا ہر ہاتھ توڑ کر میڈل کی طرح اپنے گلے کی زینت بنا لوں لیکن میری نظر میں یہ کوئی انتقام نہیں، میں اس پر بھی قدرت رکھتی ہوں کہ تمہیں قیے کی صورت ڈبے میں پیک کر کے تمہارے بیوی بچوں کو بھجوادوں یا میرے محل کے کسی نیم تاریک قید خانے میں تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ لیکن اس سے میرے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ میں تمہارے منہ پر ٹھوکتی ہوں۔“ شیتل نے فوراً ہی اپنے کہے کی عملی تکمیل کر دی۔ ”جاؤ میں تمہیں تمہاری زندگی بھیک میں دیتی ہوں۔ میرے ساتھ گزارے ہوئے اُن چند حسین اور بُرے کیف لمحوں کو اپنی زندگی کا آخری بونس سمجھ کر بمبئی لوٹ جاؤ، لکٹوں کے کھاجے کے گندے اشتہارات تمہارے منتظر ہیں۔۔۔۔۔“

گوتم اور گیتا ناشتے کے بعد کافی پی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور شہزادی عذرا اندر داخل ہوئی۔

”ارے تم؟“ گوتم نے حیران کن لہجے میں کہا۔ ”ذرا دیر پہلے آتیں تو ناشتے میں شریک ہو جاتیں۔“

”میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔“ عذرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”فی الوقت تو تم کافی ختم کرو، مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

گوتم نے جواب دینے سے قبل گیتا کی طرف دیکھا جو بظاہر تو لا تعلق بنی کافی پینے میں مصروف تھی لیکن گوتم جانتا تھا کہ دل ہی دل میں وہ عذرا کو یاد آنے والی تمام تر گالیوں سے نواز رہی ہوگی۔

”گوتم!“ اچانک ہی گیتا نے اُسے مخاطب کیا۔ ”میں کافی کے بعد اپنے میسر ڈریسر کے پاس جاؤں گی۔ تم چاہو تو شہزادی سے تنہائی میں بات چیت کر سکتے ہو۔“

اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں، کے مصداق گوتم کافی کا کپ سنبھال کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ عذرا نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا اور گوتم نے اُس کی تقلید کی۔

”آہستہ بات کرنا۔“ صوفے پر بیٹھ کر گوتم نے عذرا کو نصیحت کی۔ ”میری پیاری سی بیوی کے کان پیاز کے چھلکے ہیں۔“

”تمہیں کچھ علم ہے کہ تمہاری ہم وطن اداکارہ محل میں کیا کرتی پھر رہی ہے؟“ عذرا نے کہا۔ آواز اُس نے گوتم کے کہنے کے مطابق دھیمی ہی رکھی تھی۔

”میں نے تمہاری ہم مذہب پر کوئی جاسوس نہیں چھوڑ رکھے۔“ گوتم نے جواباً چوٹ کی۔

”کل اُس نے گولڈن لائن روم میں شیراز صوبے کے شمالی قبائلی علاقے کے ایک باغی

سردار خامی تہرانی سے ملاقات کی ہے۔“ عذرا نے گوتم کے طنز پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ”اُس کا وہ بھارتی محبوب۔۔۔ کیا نام ہے اُس کا۔۔۔ ارون کپور۔۔۔ اُسے لے کر آیا تھا۔۔۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”ارے؟“ عذرا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”تہرانی ایسے قبائل سے تعلق رکھتا ہے جنہوں نے میرے بھائی کی ناک میں دم کر رکھا تھا اور شیتل نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی اس کے گاؤں کا دورہ کرے گی۔“

”میں اب بھی اپنا پہلے والا جملہ ہی دہراؤں گا۔“

”گوتم، کیا مجھے یہ یاد دلانا پڑے گا تمہیں، کہ وہ بجٹ کنٹرول کر رہی ہے اور اس وقت فنڈز مختص کرنے کے لیے اُس کے پاس تمام اختیارات ہیں۔“

”کوئی بات نہیں، ملکہ عالیہ کچھ دنوں تک فلاح و بہبود کے کاموں سے خود ہی اکتا جائیں گی اور پھر وہ بحریت سے زیادہ وقت پیرس میں گزارا کریں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد تم اپنی ملکہ کو کسی فلم میں ہیرو کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اور ناچ ناچ کر گانا گاتے دیکھو۔ ہم لوگ مل کر اُس کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے اور یوں ملک ہمارے ہاتھوں میں رہے گا۔“

”یہ اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”میری پیاری شہزادی، ہم دونوں ایک ہی راستے کے راہی ہیں۔ جنرل مجیب بھی ہمارے ساتھ ہے، تم فکر نہ کرو، ہم جب چاہیں شیتل کو راستے سے ہٹا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ فی الوقت کچھ کئے کی ضرورت نہیں جب مناسب ہوگا میں تمہیں خود بتاؤں گا۔“



ارون کی تجویز پر وہ اپنے پرانے معمول کے مطابق جنگل میں گھروسواری پر رضامند ہو گئی تھی۔

”ہم جنگل کی آڑ لے کر آسانی کے ساتھ یہاں سے کھسک لیں گے اور کوئی ہماری غیر حاضری کو محسوس بھی نہ کر پائے گا۔“ ارون نے اُسے اطمینان دلایا تھا۔

”میں اس ملک کی ملکہ ہوں، ارون۔“ شیتل نے گھنیری پلکیں اٹھا کر اپنے محبوب کو دیکھا۔ ”مجھے یوں چوری چُپچُپ جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اب تم وہ ملکہ نہیں رہیں جو رامیر کی زندگی میں تھیں۔“ ارون نے جواب دیا۔ ”اس وقت تم اس ملک کی اہم ترین شخصیت ہو۔۔۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب رامیر زندہ تھا تو تم اُس کے دشمنوں کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھیں اور انقلاب یا کسی قاتلانہ حملے سے خوفزدہ رہتی تھیں؟“

”ہاں۔“

”کیا تمہارے پیارے سے سر میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ دشمن اب تمہارے ہیں۔“

”تم مجھے خوفزدہ کر رہے ہو۔“

”بالکل، اگر عجیب اور اُس کے چیلے چانٹوں کو تمہارے آج کے دورے کے بارے میں علم ہو جائے تو کیا وہ اسے نادانی سمجھ کر بھول جائیں گے؟“

”ہم صرف تمہارنی سے ملنے جا رہے ہیں۔“ شیتل نے صفائی پیش کی۔

”ہاں، اُس تمہارنی سے جسے تمہارا شوہر اور اُس کے بعد تمہارا چیف آف آرمی سٹاف باغی قرار دیتا ہے۔“

شیتل نے چونک کر ارون کی طرف دیکھا لیکن خاموش ہی رہی تھی۔

گھوڑے انہوں نے جنگل میں چھوڑ دیے۔ اردن ایک بند جیب پہلے ہی اُس خفیہ مقام پر پہنچا چکا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ تہرانی کے خستہ حال گاؤں میں پہنچ گئے تھے۔ شیتل نے خود کو چھپانے کے لیے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی جس میں سے اُس کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اُس نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے عورتوں کو دروازوں کے ساتھ لگے حیرت بھرے انداز میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ چیتھڑوں میں ملبوس بچے، مٹی میں اٹے ہوئے تھے جو مکان انہوں نے رہنے کے لیے بنائے تھے وہ رہائش گاہوں کے نام پر ایک دھبہ تھے۔ واقعی تہرانی نے سچ کہا تھا کہ اُس کے گاؤں میں لوگ کُتوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔

تہرانی، شیتل کو دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن اُس نے اس کی مقدور بھر خدمت کی۔ نصف گھنٹے کے قیام کے دوران تہرانی کے گھر کی خواتین میں سے کوئی شیتل کے سامنے نہیں آیا۔ وہ جب واپس روانہ ہوئی تو اُس کے دل پر افسردگی طاری تھی۔ اُس نے اپنی چادر اتار پھینکی تھی کیونکہ تہرانی نے اُسے کہا تھا کہ اُس کے گاؤں کے لوگ گو اُسے پسند نہیں کرتے لیکن گھر آئے ہوئے مہمان کو نقصان بھی نہیں پہنچاتے۔

واپسی کے سفر میں بھی شیتل زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی ایک جگہ اردن نے جیب کی رفتار کم کی تو شیتل نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”اپنی بائیں جانب دیکھو۔“ اردن نے ڈیش بورڈ سے ایک دوربین اٹھا کر اُسے تھا دی۔ ”جو نظر آئے مجھے بتاؤ۔“

”کنکریٹ کی ایک بڑی عمارت ہے۔“ شیتل نے دوربین آنکھوں سے لگا کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”اسٹاف ہیڈ کوارٹرز، آرمی انٹرنس، نیوکلیر ڈویژن۔“

”تو کیا یہ کوئی عمارت نہیں؟“

”عمارت ہی ہے۔“ ارون مسکرایا۔ ”ایک بہت بڑا پختہ بنگر، جس کی زیر زمین منزلوں کی تعداد سات ہے۔ اس وقت بھی اس عمارت میں سینکڑوں مرد اور عورتیں قوم کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انہیں چھو ندریں کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زیادہ تر زیر زمین ہی رہتے ہیں۔ اس عمارت کی خوبی یہ ہے کہ فضا سے کسی بھی صورت اس کا پتا نہیں چلایا جاسکتا۔“

شیتل نے دُور بین آنکھوں سے ہٹا کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ ”جب بحریت کا اوپن ملٹری ہیڈ کوارٹر اڑاؤ سے موجود ہیں تو اس خفیہ پناہ گاہ کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ تمہارے مرحوم شوہر کی منصوبہ بندیوں کا شاہکار ہے۔“ ارون نے جواب دیا۔ ”خود پر قابو رکھو ابھی تم نے اور بہت کچھ دیکھنا ہے، کہا جاتا ہے کہ رامیر نے آٹھ زیر زمین ہنگرز کی تعمیر کا بھی حکم دیا تھا جن میں جنگی ہوائی جہازوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔“

”لیکن کیوں۔۔۔“

ارون نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ بعض غیر ملکی فنی ماہرین کے مطابق وہ پڑوسی ملکوں کے بعض ایسے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جو صدیوں پہلے بحریت کا حصہ تھے۔“

”یقیناً اُس کے ساتھ کسی نے بھی تعاون نہیں کیا ہوگا۔“ شیتل نے معصومیت سے کہا۔ ”اُسے توقع سے بڑھ کر تعاون ملا۔“ ارون نے اُس کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ”دنیا کے بہت سے ملکوں نے اسلحہ خانوں اور رامیر نے خزانے کے منہ کھول رکھے تھے۔ اُسے اسلحہ فراہم کرنے والوں میں بھارت سرفہرست ہے۔“

”لیکن تمہیں یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔“

”ایک غیر ملکی دوست سے جو ریال کے بھارتی سفارت خانے میں ملازم ہے۔“ شیتل نے دُور بین گود میں رکھ لی۔ ”میرا خیال ہے کہ میں اس کا روبرو کے لیے ایک غلط شخصیت ہوں۔“ اُس کی آواز میں دکھ نمایاں تھا۔ ”غریب دیہاتی، میزائل، بنگر ز اور یہ فوج۔۔۔ جو کچھ آج میں نے دیکھا ہے یہ میرے کھیل کا حصہ نہیں۔“

”واقعی؟“

”ہاں،“ شیتل نے ایک لمبی سانس لی۔ ”مجھے واپس لے چلو، میں اپنے بچوں سے ملنا چاہتی ہوں اور ہاں تم کل کے لیے میری تقریر لکھنا مت بھولنا لیکن تقریر کو آسان اور سادہ فہم رکھنا۔ میں لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں شوہر کی وفات پر ابھی تک افسردہ ہوں اور یقین دلانا کہ میں جب تک تخت پر ہوں، اُن کی خادمہ کی حیثیت سے خدمات انجام دوں گی اور یہ کہ یہ اُن کی فلاح و بہبود کے لیے دن رات ایک کر دوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔“

قوم سے خطاب اطمینان بخش طریقے سے جاری تھا۔

ارون نے یہ تقریر اُسے گزشتہ شب ڈنر سے پہلے دی تھی۔ دونوں نے کھانا اکٹھے کھایا اور پھر ایک انسٹرکٹر کی طرح ارون نے اُس سے تقریر سنی۔ وہ وہیں رُکنا چاہتا تھا لیکن جب شیتل نے اُسے واپس اپنے کالج میں جانے کے لیے کہا تو وہ یوں مُنہ بسورتا ہوا گیا جیسے کڑوی گولی نگلی ہو۔

اور اس وقت وہ سنگ مرمر کی بالکونی میں ہاتھ سینے پر باندھے نعروں کے تھمنے کا انتظار کر رہی تھی۔ محل کے وسیع و عریض لان میں بے پناہ ہجوم تھا۔ بلا مبالغہ آدھا ریل دہاں اُٹا آیا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے کارروائی براہ راست نشر کی جا رہی تھی۔  
نعرے تھے تو شیتل نے رومال نکال کر چہرے سے پسینہ پونچھا اور خود کو سلسلہ کلام جوڑنے کے لیے تیار کرنے لگی۔

”میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خدمت میں کوئی دقیقہ۔۔۔۔۔“

جملہ اُدھورا رہ گیا۔ ہجوم میں سے کسی نے ملکہ پر گولی چلا دی۔ اُس نے گولی آواز سنی اور پھر محافظوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال کر اُسے اندر کی سمت دھکیل دیا۔

اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ آنا فانا ہوا تھا۔ باہر شور برپا تھا اتنی چیخ و پکار تھی کہ کسی کا ایک جملہ بھی اُس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ اُس نے کاؤچ پر سے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ صورت حال کا جائزہ لے سکے لیکن ایک دم اُس کا سر چکرایا اور زندگی میں پہلی بار اُس پر غشی طاری ہو گئی لیکن یہ بے ہوشی چند منٹوں سے زیادہ طویل نہیں تھی۔

ڈاکٹر حسینی، ارون کپور، جنرل مجیب، شہزادی عذرا اور گوتم وپس موجود تھے۔ وہ اُن کی آوازیں پہچان رہی تھی۔ ایک آواز اُسے محل کے حفاظتی انتظامات کے نگران میجر سبجانی کی بھی سنائی دی تھی۔ باقی آوازیں وہ پہچان نہیں پاتی تھی۔ شاید وہ دوسرے محافظوں کی تھیں۔

گوتم نے سب سے پہلے اُس کے پپوٹوں کی حرکت محسوس کی وہ فوراً اُس پر جھک گیا۔  
 ”بھگوان کا شکر ہے کہ نشانہ خطا ہو گیا آپ کیا محسوس کر رہی ہیں ملکہ عالیہ؟“ اُس  
 نے دریافت کیا لیکن جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی دوبارہ شروع ہو گیا۔ ”جنرل کے کچھ  
 آدمی بھی ہجوم میں موجود تھے اور اُن کا خیال ہے کہ حملہ آور کو شناخت کر لیا جائے گا۔“  
 ”مم۔۔۔۔ مجھے کون گولی مارنا چاہتا تھا؟“

گوتم کے بجائے جنرل عجیب نے جواب دیا۔ ”فوری تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے  
 ملکہ عالیہ، میں کوئی خبر ملتے ہی آپ کو بلا تاخیر مطلع کر دوں گا۔“  
 ”کیا کوئی زخمی ہوا ہے؟“

”کوئی نہیں، شکر ہے کہ ہماری انٹیلی جنس نے بچوں کو دور رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔“  
 تب اُسے یاد آیا کہ چند دن پہلے اُس نے قوم سے خطاب کے دوران نریام اور جنید کو  
 اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کیا تھا تا کہ عوام پورے شاہی خاندان کو قریب سے دیکھ سکیں۔ لیکن  
 کرنل ماجد حسین نامی ایک انٹیلی جنس آفیسر نے اس کی مخالفت کی تھی۔

”ملکہ الزبتھ بھی تو اپنے خاندان کے افراد کو ساتھ رکھتی ہیں۔“ اُس نے استدلال پیش کیا۔  
 ”یہ لندن نہیں، ریال ہے ملکہ عالیہ۔“ کرنل ماجد نے جواب دیا۔ ”اگر ملکہ عالیہ  
 اصرار کریں گی تو ہم تحفظ کی ذمہ داری سے معذرت کر لیں گے۔“  
 ”میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔“

لیکن تہرانی سے ملاقات اور خفیہ بکریز دیکھنے کے بعد اُس نے کرنل ماجد کو طلب کیا۔  
 ”میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔“ شیتل نے اُسے آگاہ کیا۔ ”میں تہار ہوں گی۔“  
 اور اب وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ نریام اور جنید اُس کے ہمراہ نہیں تھے۔

اُس نے پریشان انداز میں ادھر ادھر دیکھا اورن بھی اُسے اُن لوگوں میں دکھائی دیا  
 لیکن اُس نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر حسینی کو مخاطب کیا۔ ”مجھے میرے کمرے میں  
 لے چلئے، میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

لیکن وہ کمرے میں بند ہو کر آرام نہیں بلکہ صورت حال کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

اگلی صبح وہ ارون کے ہمراہ پروجیکشن روم میں بیٹھی تھی۔ دیوار گیر اسکرین روشن تھی جس پر کوئی دسویں بار سولہ ملی میٹر کی وہ فلم چل رہی تھی جو فوج نے قاتلانہ حملے کی کوشش کے لمحات میں ریکارڈ کی تھی۔ اُس نے جونہی کوئی غیر معمولی شے محسوس کی فوراً فلم رکوا دی۔ ایسا اُس نے کئی بار کیا اور ہر بار بغور تمام افراد کے چہروں کا جائزہ لیتی لیکن اب تک اُسے کوئی خاص چہرہ نظر نہ آ سکا تھا۔ کسی چہرے پر تناؤ نظر نہیں آتا تھا جس کا مطلب تھا کہ حملہ آور کیمرے کی آنکھ سے اوجھل تھا۔

فلم دیکھتے ہوئے اچانک ہی اُس نے اپنی کرسی کے ہتھے پر لگا ہوا کنٹرول بٹن دبا دیا۔ فلم رک گئی اور ساتھ ہی ہال کی روشنیاں جل اٹھیں۔  
 ”کیا ہوا؟“ ارون نے چونک کر پوچھا۔

”میں پروجیکشن بوتھ میں جا رہی ہوں۔“ شیتل نے پُر جوش انداز میں کہا۔ ”میں فلم کا نیکلیو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر وہی ہے جو میں سوچ رہی ہوں تو۔۔۔“  
 جملہ اُدھورا چھوڑ کر وہ اُنٹھ کھڑی ہوئی اور پردہ اٹھا کر پروجیکشن بوتھ کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

پروجیکشنسٹ فلم ریوائنڈ کرنے میں مصروف تھا تاکہ اُسے میٹل کین میں رکھ سکے۔  
 دروازہ کھلنے کی آواز پر اُس نے سر اٹھایا۔

”ملکہ عالیہ!“ اُس کی ہر اس آواز سنائی دی۔  
 ”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شیتل نے اُسے اطمینان دلایا۔ ”میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”جو حکم ملکہ عالیہ۔“  
 ”تمہارے پاس موویولا ہے؟“

”جی ملکہ عالیہ۔“

”گڈ، آؤ میں فلم کے ٹیکسٹو اُس پر دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”یہ کیا چیز ہے؟“ ارون نے دریافت کیا جو اس کی تقلید میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

”ایک چھوٹی پروڈیکشن مشین۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”اسے فلموں کی ایڈیٹنگ میں

استعمال کیا جاتا ہے۔“

”تم نے کم از کم ایک درجن بار فلم دیکھی ہے، شیتل۔“ ارون نے احتجاج کیا۔

شیتل جواب دیے بغیر پروڈیکشنسٹ کے ساتھ موویولا کی طرف بڑھ گئی۔

”اب ہم اسے آہستہ آہستہ ریوائنڈ کریں گے۔“ اُس نے اُسے آگاہ کیا۔ ”میں

سارے جوڑ دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم نے کتنی ریلیں چلائی ہیں؟“

”صرف دو، ملکہ عالیہ۔“

”اس کا مطلب ہے کہ رول میں ایک سے زیادہ جوڑ نہیں ہوگا۔۔۔ صرف درمیان

میں جہاں دونوں ریلوں کو جوڑا گیا ہوگا، آسانی سے پتا چل جائے گا۔“

”جی، ملکہ عالیہ۔“ پروڈیکشنسٹ نے ٹیکسٹو اسپول مشین پر جڑھاتے ہوئے جواب

دیا۔ شیتل اور ارون اُس کے دونوں اطراف کھڑے تھے۔ جب پوری فلم چل گئی تو شیتل نے

سراٹھا کر ارون کو دیکھا۔

”میں نے سات جوڑ کئے ہیں، تم نے کتنے کئے؟“

”چھ۔“ ارون نے جواب دیا۔

”چھ یا سات۔“ شیتل نے بلا تاہل بات اچکی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اہم

بات صرف یہ ہے کہ کسی نے فلم کی ایڈیٹنگ کی ہے۔“ وہ پروڈیکشنسٹ کی طرف مڑی۔ ”فلم

تمہیں کب اور کس نے دی تھی؟“

”کرٹل ماجد نے، آج صبح۔“

”رات بھر یہ کس کے پاس رہی؟“

”مجھے علم نہیں، ملکہ عالیہ۔“



گولڈن لائن روم کے دروازے تک ارون اُس کے ساتھ گیا لیکن پھر شیتل نے اُسے واپس کروا دیا۔

”میں نے کرنل ماجد کو بلوایا ہے۔“ اُس نے جواز پیش کیا۔ ”میں اُس سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی کرنل ماجد اُس کے روبرو تھا۔

”کرنل ماجد!“ ملکہ کی نفرتی آواز ابھری۔ ”محل میں تمہاری حیثیت کیا ہے؟“

”آپ جانتی ہیں ملکہ عالیہ۔“ کرنل ماجد اس بے شک سوال پر پریشان ہو گیا، یوں

بھی اس بے وقت طلبی پر وہ پہلے سے ہی حیرت زدہ تھا۔ ”ہیڈ آف انٹیلی جنس۔“

”بالکل۔“ شیتل نے صراحتی وار گردن اثبات میں ہلائی۔ ”تمہیں ناکام قاتلانہ حملے

کی فلمیں کب ملی تھیں؟“

”آج صبح آٹھ بجے۔“

”کیا یہ معمول کا طریق کار ہے؟“

کرنل ذو معنی انداز میں مسکرایا۔ ”ہمارے ہاں قاتلانہ حملے زیادہ نہیں ہوتے۔“

شیتل بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی لیکن جلد ہی اُس نے چہرے پر سنجیدگی دوبارہ طاری کر

لی۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ زیادہ گھل کر بات کرنی چاہیے۔“ شیتل نے ذرا سے

توقف کے بعد کہا۔ ”مجھے دکھائی جانے والی فلمیں جب کیمرامین سے لی گئی تھیں تو کس کے

حوالے کی گئی تھیں؟“

”جنرل مجیب کے۔“ کرنل ماجد نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔ ”میری رپورٹس

اور سیکرٹ سروس اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کی تمام رپورٹس بھی پہلے جنرل کے حوالے کی جاتی

ہیں وہ ہماری سرگرمیوں کا جائزہ لے کر احکامات جاری کرتے ہیں۔“

”اور یہ کب سے ہوتا ہے۔“

”جب مرحوم شاہ زندہ تھے تو وہ جنرل مجیب کے ساتھ بذات خود صلاح مشورہ کرتے

تھے۔“

”حیرت ہے۔“ شیتل نے کہا۔ ”جنرل فلمیں لے کر میرے پاس کیوں نہیں آیا؟“

”ممکن ہے جنرل آپ کو پریشان نہ کرنا چاہتے ہوں۔“

”کرئل! کیا تم اپنی ذمے داریوں میں مخلص ہو؟“

”جی، ملکہ عالیہ۔“

”تب پھر جب تک میں تخت پر ہوں، تم ہر رپورٹ میرے حضور پیش کرو گے۔“

”میں سمجھ گیا، ملکہ عالیہ۔“

”خوب، تب پھر آج سے ہمارے نئے تعلق کا آغاز ہوتا ہے۔“ شیتل نے ہاتھ پر

ہاتھ مارا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ مجھے دکھائی جانے والی فلم کی ایڈیٹنگ کی گئی تھی؟“

کرئل ماجد کے چہرے پر کبیدگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ”مجھے علم ہے، ملکہ

عالیہ۔“

”کیا تمہیں شبہ ہے کہ فلم کی یہ کٹوتی جنرل مجیب کی نگرانی میں ہوئی ہے؟“

”ممکن ہے۔“

”تو نکالے جانے والے ٹکڑے کہاں ہیں؟ کیا تم کوئی اندازہ لگا سکتے ہو؟“

”جنرل مجیب کی ایک مقفل دراز میں۔“

”میں فوری طور پر وہ فلم چاہتی ہوں۔ میں یہ نہیں جانتی کہ تم اُسے کیسے حاصل کرو گے

لیکن مجھے پندرہ منٹ میں فلم چاہیے۔ میں پروجیکشن بوتھ میں تمہاری منتظر ہوں۔“

”لیکن۔۔۔“ کرئل نے بات شروع کی۔

”مجھے فلم چاہیے۔“ شیتل حلق کے بل دہاڑی۔

کرنل ماجد پر دیکشن روم کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں قلم کا ایک چھوٹا سا کین تھا۔ شیتل نے بڑھ کر کین لے لیا اور اُس سے قلم کے چھ ٹکڑے نکال کر پر دیکشنسٹ کو تھما دیے۔

”جتنی جلد انہیں جوڑ سکتے ہو، جوڑو، میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“  
شیتل کرنل ماجد کو لے کر پر دیکشن روم میں آ گئی۔ کرنل اُس کے پہلو میں بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

”کل کے بارے میں کسی تفصیل کا علم ہے؟“ شیتل نے دریافت کیا۔  
”بہت کم، حملہ آور بھیڑ میں زد پوش ہو گیا۔ گیٹ سے باہر ایک سیاہ رنگ کی کار اُس کی منتظر تھی جو اُسے لے کر فوراً ہی روانہ ہو گئی۔“  
”اُس کا تعاقب کیوں نہیں کیا گیا؟“

”ہم نے محافظوں سے پوچھ گچھ کی ہے، اُن کا کہنا ہے کہ ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ وہ حملہ آور کو روک سکے نہ اس کا تعاقب کیا جاسکا۔ وہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکے کہ کار پر بے پناہ گرد جمی ہوئی تھی۔“  
اُس کے قریب لگا ہوا بزر چیخ اٹھا اور اُس نے اشارے سے پر دیکشنسٹ کو قلم اشارت کرنے کا حکم دیا۔

شیتل، کرنل سے مخاطب ہوئی۔ ”محافظوں کی تعداد فوری طور پر ڈیڑی کر دی جائے۔“  
”جی، ملکہ عالیہ۔“

”وہ تمام محافظ معطل کر دیے جائیں جو گولی چلنے کے وقت ڈیوٹی پر تھے۔“  
”ایسا ہی ہوگا، ملکہ عالیہ۔“

اُسی وقت قلم شروع ہو گئی اور شیتل خاموشی سے ہر چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک

اُسے چند چہرے جانے پہچانے نظر آئے تو اُس نے پروجیکشنٹ کو سلوموشن کا اشارہ کیا، حتیٰ کہ ایک چہرے پر اُس نے فلم رکوا دی۔

”کیا تم اس چہرے کو پہچانتے ہو، کرئل؟“ شیتل نے اسکرین پر نظر آنے والے کے بارے میں سوال کیا۔

”نہیں، ملکہ عالیہ، ظاہری طور پر اس کا حلیہ بحریت کے عام لوگوں کا سا ہے البتہ اس نے جس قسم کا لباس پہن رکھا ہے وہ ذرا سا مشکوک لگ رہا ہے ہم۔۔۔“

”لیکن میں اس شخص کو جانتی ہوں، کرئل۔“

”میں سمجھا نہیں، ملکہ عالیہ۔“

”دو دن پہلے میں نے قبائلی گاؤں پاوی کا دورہ کیا ہے۔ کیا تمہیں اس کا علم ہے

کرئل؟“

کرئل ایک لمحے کو جھجکا لیکن اگلے ہی لمحے وہ اندازہ کر چکا تھا کہ شیتل کو دھوکا دینا اس قدر آسان نہیں۔

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“

”مجھے اعتراف سُن کر خوشی ہوئی۔“ اُس نے اسکرین پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

”میں نے اسے پاوی کی ایک گلی میں دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں۔ میں جب اُس کے قریب سے گزری تو وہ مسلسل مجھے گھورتا رہا تھا۔۔۔ آج تم اپنے کچھ غیر مسلح آدمیوں کے ساتھ پاوی جاؤ گے اس کا ذکر کسی اور سے مت کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھ سے ملاقات سے قبل مشکوک شخص کو خوفزدہ کیا جائے۔ کیا تم سمجھے؟“

”ہم اپنی پوری کوشش کریں گے، ملکہ۔“

”میرا خیال ہے تم میری بات نہیں سمجھے، اُسے تحفظ دیا جانا ہے۔ میں رات کو اُس سے

ملاقات کرنا پسند کروں گی لیکن اُس کے بدن پر زخم تو کجا کسی خراش تک کا نشان نہیں ہونا

چاہیے۔“

سوئزر لینڈ میں پیا سے ملاقات کے بعد آج پہلی بار شیتل خود کو زندہ محسوس کر رہی تھی۔ کرنل ماجد سے اُس کی بات چیت اور پھر جس طرح اُس نے احکامات جاری کیے اور اُن پر عمل ہوا اُس کے لیے باعث تسکین تھا۔ وہ ملکہ تھی، ایک مکمل ملکہ جس کے پاس بے پناہ طاقت تھی۔ کرنل کی عقل میں بات آگئی تھی اور بہت جلد دوسروں کی عقل میں بھی آ جاتی۔

رات، عذرا اور گوتم کے ساتھ ڈنر پر اُس کی ملاقات طے تھی۔ عذرا، گیتا اور گوتم اگلی صبح ربال سے روانہ ہو رہے تھے۔ ڈنر کے لیے تیار ہوتے ہوئے دل ہی دل میں وہ گزشتہ ہفتے کے دوران ہونے والے واقعات دُہراتی رہی۔ پھر سوچ کی لہریں اُس زمانے تک جا پہنچیں جب وہ ایک اداکارہ تھی اور اپنی اداکاری سے لوگوں کو حیرت زدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ آج رات پھر اُسے ایک بہادر لیکن بے یار و مددگار بیوہ کا کردار ادا کرنا تھا۔

ڈنر سے قبل کاک ٹیل پر اُس نے اپنے مہمانوں سے کہا کہ ناکام قاتلانہ حملے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہوگی۔

”الوداعی ڈنر کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہونا چاہیے۔“ شیتل نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

کاک ٹیل ختم ہونے تک تو اُس کی بات پر عمل ہوا لیکن جونہی وہ لوگ کھانے کے لیے بیٹھے، عذرا سے صبر نہ ہو سکا۔

”ہمیں پتا تو چلنا چاہیے کہ حملہ آور سے نمٹنے کے لیے کیا کچھ کیا گیا ہے۔ رامیر کی زندگی میں بھی ایک بار ایسا ہوا تھا لیکن حملہ آور کو موقع پر ہی گولی ماری گئی تھی۔ رامیر اور اُس کی بیوی عالیہ راتوں رات منک سے باہر چلے گئے تھے اور حالات پُر سکون ہونے تک چھ ماہ وہ دونوں روم میں رہے تھے۔“

”ماضی کی کوئی بات نہیں دُہرائی جائے گی۔“ شیتل نے بیزاری سے کہا۔ ”ابھی تک

حملہ آور کے بارے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ گرفتار ہونے والوں نے کسی بھی چیز کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔“

”کوئی انعام کیوں نہیں رکھا جاتا؟“ گوتم نے تجویز پیش کی۔

”نہیں، گوتم۔“ شیتل نے فوراً مخالفت کی۔ ”کوئی انعام نہیں رکھا جائے گا۔ میں نے حکم دیا ہے کہ معاملے کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل رکھا جائے اور تم جانتے ہو کہ میرے احکامات کی تعمیل ہونی چاہیے۔“

”کیا یہ بہتر نہیں کہ انٹیلی جنس کو اس کا کام کرنے دیا جائے؟“ گوتم نے کہا۔

شیتل نے اس کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ باقی کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ ڈنر ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”گیتا! میں یہاں تمہیں خدا حافظ کہتی ہوں اس یاد دہانی کے ساتھ کہ ملازما میں تمہارا سامان پیک کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کل میں تمہارے شوہر کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔“ وہ گوتم کی طرف مڑی۔ ”میرے خیال میں بقول تمہارے معاملہ سیدھا سادا ہے۔“

”بالکل۔“ گوتم نے فوراً روبرو کی طرح سر ہلایا۔

”کل صبح دس بجے، گولڈن لائن روم۔“ شیتل نے کہا اور عذرا کی طرف مڑی۔ ”اور تم عذرا، کیا میرے کمرے میں آنا پسند کرو گی؟ میرے پاس تمہارے لیے ایک حیران کن تحفہ ہے جو راہ میری تمہیں دینا چاہتا تھا۔“

عذرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”تم کتنی اچھی ہو بھابی!“

صوفے پر بیٹھی عذرا بے چینی کے ساتھ شیتل کو اُس کے کمرے کی میز کی دراز ٹٹولتے دیکھ رہی تھی۔

”بریسلٹ ہے؟“ اُس نے ہڈ جوش انداز میں پوچھا۔ ”را میر نے یہ مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ایک کمبوڈین شہزادے نے ہماری والدہ کو تنہا دیا تھا۔“  
 شیتل نے دراز سے کارڈ بورڈ کا ایک ڈبہ نکالا۔ ”یہ بریسلٹ نہیں ہے، عذرا۔“  
 ”پھر کیا ہے۔۔۔“

”اس سے بھی قیمتی شے۔“ شیتل نے ڈبہ عذرا کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”اُسے کھولو۔۔۔! ابھی۔“

عذرا کے اعصاب تن گئے، اُس نے شیتل پر نگاہیں جما کر ڈبہ کھول ڈالا۔ ڈبے میں کئی کاغذات رتھے ہوئے تھے۔

شیتل جھک کر عذرا کے قریب ہو گئی۔ ”انہیں پڑھو۔“ اُس نے حکم دیا۔ عذرا نے چونک کر شیتل کو دیکھا۔ اُسے اپنی بھابی کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا تھا۔  
 عذرا نے جلدی جلدی کاغذات پڑھ ڈالے۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ یک دم چلا اٹھی۔ ”کوئی شخص مجھے تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”بے وقوف، تباہ تو تم ہو چکیں۔ اس الزام کے ہر ہر لفظ کی تصدیق کی جا چکی ہے۔“  
 شیتل نے حیرت کے انداز میں سر کو جنبش دی۔ ”تمہارا اور مجیب کا خیال تھا کہ یہ منصوبہ کامیاب رہے گا؟ میں نے خود اُس نوجوان سے بات کی ہے جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ جب میں نے اُس سے موت کی سزا کے بجائے جیل بھجوانے کا وعدہ کیا تو اُس نے سب کچھ اگل دیا۔ کتنے بیوقوف ہوتم دونوں، بالکل سیکرٹ پولیس کی طرح گدھے اتنے کچے آدی کو

مجھ پر قاتلانہ حملے کے لیے منتخب کیا۔ وہ تو تم لوگوں پر اعتماد کیے بیٹھا تھا کہ جب میں راستے سے ہٹ جاؤں گی تو تم اسے سونے سے لاد دو گے۔“

”یہ غلط ہے۔“ عذرا نے کمزوری آواز میں احتجاج کیا۔

”بکومت، حملہ آور اور اُس کے نو جوان ساتھی یہاں سے فرار ہو کر اپنے گاؤں واپس گئے تھے۔ سردار خامی تہرانی نے انہیں کہا تھا کہ اُن لوگوں نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اب حملہ آور اور اُس کے ساتھی جیل میں تمہارے اور جنرل کے خلاف فردِ جرم عائد ہونے کے منتظر ہیں۔“

عذرا ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ”تمہارا یہاں سے کیا تعلق ہے؟“ وہ حلق کے بل چیخی۔ ”تم یہاں حکومت نہیں کر سکتیں، میں اور مجیب تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ یہ منلک ہماری ملکیت ہے، ہمارے خاندان کی ملکیت ہے۔ تم بے شک رامیر کی ملکہ تھیں لیکن ہمارے لیے وہی دو ٹکے کی ہندو اداکارہ ہو جو نکلے نکلے کے عوض اپنے آپ۔۔۔“

شیتل کا زوردار تھپہ عذرا کے منہ پر پڑا۔ اُس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

”اب اگر تم نے مجھے ہندو کہا تو میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔“ شیتل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”میں دو ٹکے کی اداکارہ ہوں یا چار ٹکے کی، مسلمان ہوں اور یہ بھی سُن لو کہ میں یہ منلک اُس وقت چھوڑ دوں گی جب میری مرضی ہوگی۔ کریم اُس وقت بادشاہ بنے گا جب میں اُس کے لیے جگہ خالی کروں گی اور کون جانتا ہے کہ اس میں کتنا وقت لگے؟“

”تم ایک پاگل عورت ہو۔“ عذرا نے بائیں ہاتھ سے گال کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”فوج مجیب کے ساتھ ہے۔ وہ جب چاہے تمہیں دودھ سے مکھی کی طرح نکال سکتا ہے۔“

”صحیح کر لو پیاری عذرا، فوج مجیب کے باپ کی ملکیت نہیں، میری ملکیت ہے۔“

شیتل کی آواز بتدریج بلند ہوتی چلی گئی۔ ”ہو سکتا ہے بعض لوگ اُس کے حمایتی ہوں لیکن تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ انگلیوں پر گنے جانے والے لوگ مجیب کے لیے فوج سے ٹکڑائیں گے؟ کبھی نہیں! اور اس وقت تو قطعی نہیں جب انہیں علم ہوگا کہ میں اُن کی بہتری کے لیے متحدہ منصوبوں میں دلچسپی رکھتی ہوں، میرے پاس مجیب کے لیے الگ منصوبہ ہے۔“

عذرا کی آنکھیں دلچسپی لینے کے انداز میں سکون گئیں۔



”میں عارضی طور پر اس کی جاں بخشی کر رہی ہوں کیونکہ میں اپنے ہاتھ خون آلود نہیں کرنا چاہتی۔“ شیتل نے کہا۔ ”مجیب کو بتایا جائے گا کہ تم دونوں کا راز افشا ہو گیا ہے۔ پھر میں اُسے فوج سے ریٹائر کر کے اپنے موجودہ سفیر کی جگہ انگلینڈ بھیج دوں گی۔ ایک دن بحریہ کے سر پھرے نوجوان، قانون اپنے ہاتھ میں لے کر لندن کے بحری سفارت خانے پر دھاوا بول دیں گے اور مجیب حادثاتی طور پر مارا جائے گا۔ یوں یہ میری ذمہ داری نہیں ہوگی۔ میں لندن والوں کو ایک احتجاجی خط لکھوں گی اور اُن سے قاتلوں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کروں گی۔ کیوں کیا خیال ہے؟“

”تمہیں یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گی؟“ عذرا کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹنے کو آرہی تھیں۔

”کیوں نہیں؟“ شیتل نے قہقہہ لگایا۔ ”میں آج رات تمہاری گرفتاری کے احکامات بھی جاری کر سکتی ہوں، میں حملہ آور اور اُس کے ساتھیوں کی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت سے ثبوت فراہم کر دیے ہیں، اتنے کہ میں تمہیں جیل میں ڈال سکوں، پھر تم پر مقدمہ چلے گا اور ہو سکتا ہے کہ میری خواہش پر تمہیں ریال کے سب سے بڑے چوراہے میں سرعام پھانسی دے دی جائے یا زندگی بھر کے لیے کسی تنگ و تاریک جیل میں بند کر کے چابیاں سمندر میں پھینک دی جائیں۔“

”کیا تم سنجیدہ ہو؟“

”سو فیصد۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔“ شیتل بھر گئی۔ ”اُس وقت سے جب تم سینٹ موریز میں اپنے بھائی سے لڑی تھیں۔ تب تک وہ جیسا بھی تھا، میں اُس سے پیار کرتی تھی۔ وہ میرا شوہر تھا اور میں سو فیصد اُس کی وفادار تھی۔ شادی سے پہلے میرا کردار جو بھی تھا لیکن شادی کے بعد میری زندگی میں رامیر کے علاوہ کوئی نہیں آیا تھا۔ میری تباہی اور مجھے وفا کی راہ سے بھٹکانے کی ذمہ دار تم ہو، جب تم نے رامیر سے اُس کی دوستوں اور محبوباؤں کا ذکر کیا، تم جانتی تھیں کہ میں کسی بھی لمحے وہاں آ سکتی ہوں۔ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی

تھیں اور اس میں کامیاب ہو گئیں۔ تم اُس کے کر تو ت پہلے سے جانتی تھیں پھر ایک ایسے موقع پر انہیں دہرانے کی ضرورت کیا تھی جب رامیر کو اور تمہیں یہ توقع تھی کہ میں انہیں سن سکتی ہوں، لیکن تمہاری خواہش تھی کہ میں سنوں اور ایسا ہی ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دُور ہو گئے۔ اُس دن کے بعد میری زندگی پہلے جیسی نہ ہو سکی۔ اُس وقت تمہیں موقع ملا اور تم وار کر گئیں آج مجھے موقع ملا ہے تو میں بھی تمہاری زندگی پہلے جیسی نہ رہنے دوں گی۔“

”تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“ عذرا نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

”خوش قسمتی سے تمہاری ملکہ، تعلیم یافتہ ہے، میں تمہیں اُس طرح تباہ نہیں کروں گی جیسے تم نے مجھے کیا۔ اس طرح تو تم ایک ہی رات میں سب کچھ بھول جاؤ گی۔ میں چاہتی ہوں کہ جس طرح میں نے پانچ سال عذاب جھیلے ہیں، تم بھی جھیلو۔ میں تمہیں ان پانچ سالوں کے عوض عمر بھر کا عذاب دوں گی۔ میں تمہاری جلاوطنی کے احکامات صادر کر رہی ہوں۔ تمہیں شاہی خزانے سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ آج سے ختم کیا جاتا ہے۔ اب تم اپنی خالی انگلیوں کے سہارے جینا اور میں قہقہے لگاؤں گی۔ میری بلا سے اب تم سمندر میں ٹکودمرو یا پھر سے منشیات۔۔۔۔“

”تم کُتیا ہو!“ عذرا چلائی۔ ”میں ایک بیسوا کو اپنی زندگی سے نہیں کھیلنے دوں گی۔“ وہ مُٹھیاں بھینچ کر شیتل پر جھپٹی لیکن شیتل نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلاں پاؤں پکڑ لیں۔

”محتاج رہو، عذرا۔“ اُس نے اُسے سرزنش کی۔ ”تم میرے ملک اور میرے محل میں موجود ہو، مجھے دھمکیاں مت دو ورنہ میں ملکہ کی سطح سے نیچے بھی گر سکتی ہوں۔“

عذرا نے اپنی کلاں چھڑائیں اور دروازے کی سمت بھاگ کھڑی ہوئی۔ ”تم بے وقوف ہو، اندھی ہو۔“ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ چیخی۔ ”ابھی میرے پاس ایک مہرہ باقی ہے۔۔۔۔ گو تم تمہیں تباہ کر کے رکھ دے گا۔“

شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہن کر شیش اپنے بیدروم سے کوریڈور میں نکل آئی۔ اُسے دیکھتے ہی باوردی محافظ تن کر کھڑا ہو گیا اور پھر پورا کوریڈور محافظوں کی ایڑیوں سے گونج اٹھا۔ شیش نے جونہی قدم آگے بڑھائے، محافظوں نے اُس کا ساتھ دینا چاہا لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ساتھ آنے سے منع کیا اور بے تکلے قدم اٹھاتی گولڈن لائن روم کے دروازے تک پہنچ گئی۔

نصف شب کا عمل تھا اور گوتم سے ملاقات میں ہنوز دس گھنٹے باقی تھے۔  
 ”معاملہ بالکل سیدھا سادا ہے۔“ اُسے ایک روز پہلے گوتم کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔ ”تمہیں صرف کاغذات پر دستخط کرنے ہیں، میں اور گیتا یہاں سے سیدھے دہلی جائیں گے تاکہ اہم دستاویزات خود وزیراعظم کو پیش کر سکوں۔“  
 ٹھیک ہے۔ اُس دل میں ہی دل میں سوچا۔ تم آؤ تو سہی، میں تمہارے استقبال کو تیار ہوں۔

اُس نے گولڈن لائن روم کے دروازے کی چابی نکالی اور مقفل دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اُسے یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ روشنی کرنے کے لیے سوئچ کی طرف بڑھتی اچانک ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔  
 وسیع و عریض کمرے کی دوسری سمت والا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شیش نے پنسل ٹارچ کی روشنی بھی دیکھی۔ پہلے اُس کا جی چاہا کہ وہ جانے والے کو پکارے لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں وہ مسلح نہ ہو اُس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ البتہ یہ سوچ کر اُس کا دماغ جلنے لگا کہ مملکت کے اس اہم ترین کمرے میں چوروں کی طرح داخل ہونے کی ہمت کس نے کی تھی؟

جو دروازہ کھل کر بند ہوا تھا وہ فریدہ کے کمرے میں جاتا تھا جسے رامیر نے کوئی بارہ

سال قبل اپنی سیکرٹری بنایا تھا، لہذا یہ بات طے تھی کہ داخل ہونے والی فریدہ ہی تھی۔  
 شیتل نے کندھے جھٹکے اور تیزی سے آگے بڑھ کر سوئچ دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے کمرہ  
 روشنی سے نہا گیا۔ اُس نے غائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا لیکن بہ ظاہر کوئی چیز اپنی  
 جگہ سے ہلی نظر نہیں آئی، حتیٰ کہ کاغذات بھی اُسی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے جس ترتیب  
 سے اُس نے رکھے تھے۔

وہ چند لمحے کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی اور پھر اپنی میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر اُس  
 کی نگاہیں چاروں سمت گھوم رہی تھیں۔ سامنے والی دیوار پر رامیر کے والد اور اُس کے  
 سسر کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ شیتل کی نگاہ جونہی اُس پر پڑی، اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔  
 اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ تصویر بالکل سیدھی لگی ہوئی تھی مگر اب وہ ترچھی تھی۔

”خفیہ تجوری۔“ شیتل نے زیر لب کہا اور تیر کی طرح تصویر کی طرف بڑھی۔ اُس نے  
 بھاری بھر کم تصویر کو ایک طرف کھسکایا اور فوراً ہی اُس کے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔

وہاں واقعی ایک خفیہ تجوری موجود تھی۔ جس پر نٹھامٹا سا پش بٹن لگا ہوا تھا۔ اُس نے  
 بٹن دبایا اور تجوری کا دروازہ ایک سمت کھسک گیا۔ تجوری اُس کے قد سے بلند تھی۔ بچوں کے  
 بل اُنھہ کر اُس نے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ صرف ایک چیز وہاں موجود تھی اور وہ ایک چھوٹا سا  
 پیکٹ تھا۔

شیتل نے الٹ پلٹ کر پیکٹ کا جائزہ لیا۔ تجوری بند کی اور تصویر صحیح کرنے کے بعد  
 اپنی کرسی پر آ بیٹھی اُس نے جلدی سے پیکٹ کھول ڈالا۔ ایک پاکٹ ساز ڈائری اُس کے  
 ہاتھوں میں تھی۔ شیتل نے ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی اور پھر اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔

جب وہ گولڈن لائن روم سے برآمد ہوئی اُس وقت رات کا اندھیرا اور دِن کا اُجالا اُفق پر گلے ملنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی ملازمہ کو ہدایت کی کہ اُسے صبح دس بجے سے قبل بیدار نہ کیا جائے اور ناشتے پر مسٹر گوتم کو بتا دیا جائے کہ ملکہ سے ملاقات اب دس کے بجائے گیارہ بجے ہوگی۔

نیریت نے اُسے چکایا اور گیارہ بجتے سے چند منٹ قبل شیتل تیار ہو کر بیدار روم سے نکل آئی۔ نیوی بلیو اسکرٹ اور نیوی بلیو بلاؤز میں جس کا کالر سفید رنگ کا تھا، وہ آہستگی سے گولڈن لائن روم کی طرف روانہ ہوئی۔ گوتم جب ملاقات کے لیے اندر داخل ہوا اُس وقت وہ اپنی بڑی میز کے عقب میں شاہی گرسی پر براجمان تھی۔

”تمہیں کچھ دیر بعد وطن روانہ ہونا ہے اس لیے میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گی۔“ شیتل نے استقبالیہ جملوں اور ملاقات کے وقت میں تبدیلی پر معذرت کرنے کے بعد گوتم کو مخاطب کیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ۔۔۔ ہاں۔۔۔“ اس کے ہاتھ میز پر پڑے کاغذات کے ڈھیر کی طرف بڑھے اور پھر اُس نے ایک فائل میں سے چند کاغذات نکال کر سامنے رکھے۔ ”مجھے اسی دستاویز۔۔۔ معاہدے پر دستخط کرنے تھے نا۔۔۔“

”ہاں۔“ گوتم نے کاغذات کھسکا کر اپنی جانب کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں۔“ اُس نے کاغذات کا آخری صفحہ نکال کر شیتل کے سامنے کر دیا جس کے آخر میں سُرخ روشنائی سے ایکس کا نشان لگا ہوا تھا۔ ”تمہارے دستخطوں کے ساتھ ہی روانہ ہو جاؤں گا۔“ اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک طلائی قلم نکال کر کھولا اور شیتل کی طرف بڑھا دیا۔

”نہیں گوتم۔“ شیتل نے مضبوطی سے کہا۔

”کیا تم دستخطوں کے لیے اپنا قلم استعمال کرنا چاہتی ہو؟ بہت سے سربراہ ایسا ہی

کرتے ہیں۔“

”نہیں گوتم۔“ شیتل نے اپنے الفاظ دہرائے۔ ”میں دستخط نہیں کر رہی۔ تمہارے قلم سے نہ اپنے قلم سے۔“

وہ سمجھا شاید شیتل مذاق کر رہی ہے۔ ”ہڈ کے قلم سے۔۔۔؟“  
 ”میں نے یہ دستاویز پڑھی ہے اور مجھے یہ پسند نہیں آئی۔“  
 ”لیکن کیوں؟“ گوتم نے پلکیں جھپکائیں۔

”اس لیے کہ یہ مزید فوجی ہتھیاروں کی خریداری کا معاہدہ ہے۔ مزید ہوائی جہاز اور جنگی کشتیوں کی خریداری کی دستاویز ہے جس کے لیے ہمیں دو ارب ڈالر ادا کرنے ہوں گے، نہیں گوتم، ہم اس کے قائل نہیں ہو سکتے۔“

گوتم نے اپنا چشمہ اتار کر کوٹ کی آستین سے صاف کیا اور مسکرا دیا، ایک زخمی مسکراہٹ۔۔۔ ”ان ہتھیاروں کی خریداری تمہارے شوہر کی سب سے بڑی خواہش تھی اور میں نے ایک سال تک اپنی حکومت کو باور کرایا ہے کہ بحریہ کا وجود اُس کے لیے کس قدر اہم ہے۔ اگر وہ بحریہ کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ اسلحہ فراہم کریں۔“

”معمولی جھڑپوں کو سنگین سرحدی تنازعات کا نام نہیں دیا جاسکتا۔“

”لیکن رامیر ایسا ہی سمجھتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ واپس محل پہنچ کر سب سے پہلے اس معاہدے پر دستخط کرے۔“

”مجھے اس کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، ہمارے پاس پہلے ہی خاصا زیادہ اسلحہ موجود ہے۔“

”کیا تم اس بات سے متفق ہو کہ بحریہ کی نازک صورت حال کے باعث اسے مضبوط ہونا چاہیے؟“

”بالکل۔“ شیتل نے جواب دیا۔

”تو پھر یہ انکار۔۔۔؟“ گوتم نے جملہ ادھورا چھوڑ کر شیتل کی طرف دیکھا۔

”معاہدے کے بغیر دہلی واپسی میری شکست ہوگی۔“

”تم اس سے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔“

”مگر شاید تم نہ ہو سکو؟“

شیتل بھڑک اٹھی۔ ”تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو گوتم؟ تمہارا خیال ہے میں بچی ہوں؟ میری بات غور سے سنو، فریدہ راتوں رات یہاں سے جا چکی ہے اور اُس نے تمہارے لیے کوئی الوداعی پیغام نہیں چھوڑا۔“

”اوہ۔“ گوتم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اُسے تمہیں بتانا چاہیے تھا کہ رامیر کے لیے اس خریداری کی کیا اہمیت تھی۔“

”بھاڑ میں جھوکو اس اہمیت کو۔“ شیتل چڑ گئی۔ ”تمہارا جہاز تمہارا منتظر ہے، میں صاف اور سیدھی بات کروں گی، کیا تم جانتے ہو کہ رامیر کے پاس ایک ڈائری تھی؟“

گوتم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”نہیں۔“

”فریدہ جانتی تھی اور اُس نے اسے پڑھا بھی لیکن بُرا ہوا کہ وہ اسے یہیں چھوڑ گئی۔“

گوتم آگے کی طرف ٹھک آیا۔ ”مجھے دکھاؤ۔۔۔“

”اور مزید وقت ضائع کرو؟ کوئی ضرورت نہیں، تم جانتے ہو کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ اُس نے ڈائری میں اُس تمام اسلحے کی تفصیلات لکھ رکھی ہیں جو تمہاری معرفت خریدا گیا۔ اور اس پر تمہیں جو کمیشن دیا گیا وہ بھی درج ہے۔“

گوتم نے کندھے اُچکائے۔ ”کوئی غیر قانونی بات نہیں۔“

”میں تمہیں رامیر کی ڈائری کا ایک نوٹ سناتی ہوں شاید وہ بھی غیر قانونی نہ ہو۔“

شیتل نے طنز کیا۔ ”اٹھارہ طیارے، میزائل لانچرز اور ٹینک خلیج فارس کی بندرگاہ پہنچے لیکن انہیں بحریت میں اتارا گیا، کارگو بوس کا رخ فوری طور پر صومالیہ کی طرف موڑ دیا گیا۔ صومالیہ سے ادا ہوئی، جرمن مارک میں ہوئی جسے میرے ذاتی اکاؤنٹ میں زیورچ منتقل کر دیا گیا۔“

”ناممکن۔“ گوتم بول اٹھا۔ ”یعنی رامیر نے میری معرفت خریدے ہوئے ہتھیار دوبارہ بیچ ڈالے؟ میں نہیں مانتا۔“

”اور بھی بہت کچھ ہے، تم زیر زمین بینکرز کے بارے میں جانتے ہو؟“

گوتم نے محتاط انداز میں سر ہلایا۔

”تم جانتے ہو کہ اُن کی ضرورت نہ تھی۔ رامیر کا دعویٰ تھا کہ وہ مُلک بچار رہا ہے لیکن

اُس کی اپنی ڈائری کے مطابق وہ ملکی دولت کو زیورچ میں جمع کر رہا تھا۔ بینک کی تمام رسیدیں میرے پاس پہنچ چکی ہیں جن سے مجھے پتا چلا ہے کہ میرا شوہر ایک مُلک کا بادشاہ ہونے کے علاوہ دُنیا کا امیر ترین شخص بھی تھا۔ اس کے ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں کہ وہ اربوں ڈالر کا مالک تھا۔“

”اُسے ڈر تھا کہ وہ کہیں اقتدار سے محروم نہ ہو جائے اور اُسے جلا وطن نہ ہونا پڑے۔ یہ دولت اُس نے اپنے بُرے وقتوں کے لیے جمع کی تھی۔“

”لیکن تمہیں کون سی جلا وطنی ملنے والی تھی؟“ شیتل نے مجھے بے لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں اور جنرل عجیب کو بھی تو آدھا آدھا حصہ ملتا رہا ہے۔“

”لگتا ہے خاصی حتمی کر کے آئی ہو؟“ گوتم تھکے تھکے انداز میں مُسکرایا۔ ”اب کیا چاہتی ہو؟ میرا راز فاش کر دو تو امیر بھی عریاں ہو جائے گا اور میرا خیال ہے کہ بحریہ اپنے سابق بادشاہ پر اُسی کی بیگم کے الزامات کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ یہ پہلے ہی ایک متاثرہ مُلک ہے۔ تمہارے سامنے بہت سے مسائل ہیں۔ صرف اعتماد ہی ان مسائل کا حل ہے۔ جب کچھ اعتماد حاصل کر لو تو پھر بے شک ان معاملات کو بھی دیکھ لینا۔“

”میری یہ خواہش نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“

”سب سے پہلی یہ۔“ شیتل نے غیر دستخط شدہ مسودہ میز سے اٹھایا اور اُسے کھڑے کھڑے کر کے ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔

گوتم حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک لمبے لمحے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ ”زبردست۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”اگلی خواہش۔“

”تمہاری اور تمہاری قابلِ نفرت بیوی کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بحریہ اور میری زندگی سے بے دخلی۔“ شیتل دانت کچکا کر بولی۔ ”یہاں سے دفع ہو جاؤ اور اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ میں اس مُلک کو عزت و وقار سے چلانا چاہتی ہوں اور یہاں سے خوف و سراسیمگی اور تشدد دیکھنا ختم کر دینا چاہتی ہوں جس کے لیے یہ دُنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔۔۔ ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی میں تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر رہی ہوں میں۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ سانس



لینے کوڑکی۔

”زبردست۔“ گوتم گُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم ابھی ایک بچی ہو۔“ اُس نے میز کے کناروں پر ہاتھ جما کر شیتل کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”اور بے خبر بھی۔۔۔ دُنیا کی حقیقتوں کے بارے میں۔۔۔۔ تم نے مجھے کہا کہ میں بچ نکلوں گا اور واقعی ایسا ہوگا لیکن میں تمہیں ناکام کا خطاب دے کر جا رہا ہوں اور تم خود دیکھنا کہ میری بات میں کتنا جھوٹ ہے، اصول پرستی اچھی چیز ہے لیکن صرف بہلولوں اور بغلولوں کے لیے۔۔۔ بادشاہوں کے لیے نہیں۔۔۔

”اس مُلک میں دوبارہ کبھی چور اور لُٹیرے حکمرانی نہ کر سکیں گے۔“ شیتل نے مضبوطی سے کہا۔ ”کم از کم اُس وقت تک جب تک میں زندہ ہوں۔“

”اور تمہارے خیال میں تم کب تک جی سکو گی؟“

”تمہیں جہنم میں دیکھنے کے لیے، ایک طویل عرصے تک۔“

گوتم دو قدم پیچھے ہٹا۔ اُس نے مُکا تان کر فضا میں لہرایا اور پھر جھک کر اُس نے شیتل کو تعظیم دی۔

”تو پھر میں جہنم کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔ ملکہ عالیہ، گڈبائی۔۔۔

میری پرا تھنا ہے کہ بھگوان آپ پر رحم کرے اور آپ کو حکمرانی کے ڈھنگ سکھائے۔“

شیتل بے حد چڑچڑی ہو گئی تھی۔

”آرام سے جاؤ۔“ اردن نے اُسے تسلی دی۔ ”خود پر قابو نہیں رکھو گی تو دھاکے سے پھٹ جاؤ گی۔“

”اس وقت میں کسی بھیانک مسئلے پر غور نہیں کر رہی، پروفیسر عثمانی سے ملاقات کا جائزہ لے رہی ہوں۔“ شیتل نے اُسے بتایا۔ ”کیا عظیم آدمی ہے؟“

اردن غمگین انداز میں مسکرا دیا۔

شیتل فوراً معاملے کی تہ تک جا پہنچی۔ ”ارے میرا یہ مطلب نہیں تھا، ڈارلنگ۔“ اُس نے اپنے نرم و نازک بازو اُس کے گرد حائل کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اُس منصوبے کی بات کر رہی تھی جس کے تحت بحریہ کے غریب لوگوں کو مفت رہائش فراہم کی جانی ہے۔ پروفیسر کا کہنا ہے کہ جب سے وہ وزیر ہاؤسنگ بنا ہے اس جیسا کوئی منصوبہ اُس کی نظر سے نہیں گزرا، میں مکانات کے بعد ملک کے طول و عرض میں اسپتال اور اسکول کھولنے کا پروگرام بھی بنائے بیٹھی ہوں۔“

اردن نے اُسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ ”تم ابھی تک میری ہو، یور میجسٹی؟“ اُس کا انداز

سوالیہ تھا۔

شیتل اُس کے حصار میں آ کر سسک پڑی۔ ”کچھ نہیں بدلا، ڈارلنگ، میں تمہاری ہوں، وعدہ کرو مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ اردن نے جواب دیا لیکن اُس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں

تھی۔

ریسپشن ہال میں بے چینی سے چہل قدمی کرتی ہوئی شیتل، قاہرہ سے سلمیٰ کی واپسی کی منتظر تھی۔ جونہی وہ اُسے سیڑھیاں چڑھتی نظر آئی اُس نے بڑھ کر سلمیٰ کو گلے لگا لیا۔  
 سلمیٰ نے کمزوری مسکراہٹ سے شیتل کا جائزہ لیا۔ ”کیا ہر وہ عورت جس پر قاتلانہ حملہ ہو تمہارے جیسی ہوتی ہے؟“

”قاتلانہ حملہ؟ اوہ وہ کل والی خبر۔“

”ہاں مصر میں اس کا بڑا چرچا تھا۔ میں نے متعدد بار تمہیں فون کیا لیکن اتفاق سے ہر بار لائن مصروف ملی۔“

شیتل نے مسکرا کر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں قدم بہ قدم سلمیٰ کے اپارٹمنٹ تک پہنچیں۔ ملازموں نے سلمیٰ کا سامان بھی پہنچا دیا تھا۔

”تم بتاؤ، فاروق کے ساتھ کیا سلسلہ رہا؟“

”اُسے فلم سے الگ کر دیا گیا ہے۔“ سلمیٰ نے طویل سانس لے کر کہا اُس کے بھاری بھر کم چہرے پر خزاں اُتر آئی تھی۔ ”اور فی الحال وہ میرے ساتھ بھارت جانے کو بھی تیار نہیں ہوا۔“

”یہ تو برا ہوا۔“ شیتل نے تانتف سے کہا۔ ”تم کہو تو میں فاروق سے مل کر۔۔۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ سلمیٰ نے اُس کی بات کاٹ دی ”ابھی میرے پاس ایک

ہتھیار باقی ہے۔“

شیتل نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

”میں ماں بننے والی ہوں۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔ ”اور جونہی یہ خبر فاروق کو ملے گی وہ

گٹے کی طرح ڈم ہلاتا میرے پیچھے آئے گا۔“

”زبردست۔“ شیتل کو واقعی خوشی ہوئی تھی۔

”تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ سلمیٰ نے پوچھا۔ ”تم چل رہی ہو یا ٹھہر چکی؟“  
”فی الحال رُکوں گی۔“ شیتل نے ہولے سے کہا۔ ”میں نے جاب کو پسند کرنا شروع  
کر دیا ہے، میرے اور ارون کے ذہن میں لاکھوں منصوبے ہیں لیکن فی الحال لُچ ٹائم۔۔۔۔  
باقی باتیں شام کو کریں گے۔“

oo

شیتل۔ ارون اور سلمیٰ ابھی ابھی چائے سے فارغ ہوئے تھے۔ سلمیٰ نے بڑھ کر تکیں ٹی وی آف کر دیا جس پر ڈنیا بھر کی اہم خبریں سنائی جا رہی تھیں۔

”تمہارے ٹمک میں یہ بھی خوب رہی؟“ سلمیٰ نے ہنس کر اپنی سیٹلی کو مخاطب کیا۔  
 ”ریال ٹی وی کے مطابق ڈنیا بھر میں تو آگ لگی ہوئی ہے اور یہاں بحریت میں سوائے پھولوں کی نمائش کے کوئی خاص خبر ہی نہیں۔“

”اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟“ شیتل کے بجائے ارون نے کہا۔ ”ٹی وی تو درکنار، بحریت میں اکثریت کے پاس پہننے کے لیے جوتے تک نہیں۔“

شیتل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”فکر نہ کرو میرا سب سے پہلا کام عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہی ہوگا۔ ٹیلی ویژن جیسی عیاشی کا دوسرا نمبر ہے۔ بہت جلد لوگوں کو احساس ہو جائے گا کہ ہم اُن کی بھلائی چاہتے ہیں۔“

”مجھے تم دونوں تالاب میں تیرتی بے پروا اور معصوم لٹخوں کا جوڑا نظر آتے ہو۔“ سلمیٰ نے اُکھڑے اُکھڑے انداز میں کہا۔ ”گو تم اور دوسروں کی مخالفت مول لے کر تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم دونوں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اگر نہیں تو پھر کسی روز فوجی ٹینک محل کے صدر دروازے پر نظر آئیں گے اور تم دونوں کو پٹو ہوں سے کھینچنے کے لیے کسی اندھیری کوٹھڑی میں دھکیل دیا جائے گا۔“

”مجیب ایسا خطرہ مول نہیں لے گا۔“ شیتل نے جواب دیا۔

”یہ بھی تمہاری بھول ہے، پھر سعودی عرب کا معاملہ بھی تو سر پر ہے۔ میں نے ٹائم میگزین میں پڑھا ہے کہ وہ تمہارے کچھ علاقے پر ملکیت کا دعوے دار ہے۔“

”تم ٹائم خریدنا اور پڑھنا بند کر دو۔“ ارون نے مشورہ دیا۔ ”اُن کا انداز جھٹایا ہوا ہے لیکن تم خاطر جمع رکھو، شیتل کو لوگوں کی حمایت حاصل ہے اور وہ فوج سے زیادہ طاقت ور

ہیں۔“

”میرا دعویٰ ہے کہ مجیب جیسا شاطر تم لوگوں سے دس ہاتھ آگے ہے، کسی روز وہ قتلے قتلے بنا کر فریج فرائز کے ساتھ نوش کر جائے گا۔“

ارون نے شیتل کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مناسب وقت پر مجیب کا سر بھی پکھل دیا جائے گا، ہم جانتے ہیں کہ کیا کرنا ہے؟“

”خیر، تمہارے بچوں کا کیا ہوگا شیتل؟ کیا تم ان کے لیے خوف زدہ نہیں ہو؟“

”میں خاصی فکر مند ہوں لیکن اگر میں بحریت کو دشمنوں سے پاک نہیں کروں گی تو میرے بچوں کو باقی زندگی جلا وطنی میں گزارنی پڑے گی۔ ایک بار مجھے اپنے پروگرام متعارف کرا لینے دو پھر دیکھنا کہ لوگ کس طرح میرے تلوے چائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میں یہاں بھی سویڈن، انگلینڈ، ڈنمارک اور جاپان جیسی بادشاہت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ ارون، کریم کو واپس سوئٹزر لینڈ چھوڑنے جا رہا ہے اور میں نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ جو کروں گی اچھا ہی کروں گی۔“

”مجھے نیند آرہی ہے۔“ سلی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دُور سے خطرے کے سائرن سنائی دے رہے ہیں لیکن خُدا کرے یہ میرا واہمہ ہو۔“

سوئٹزر لینڈ کے برف زار دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شہزادہ کریم، تنہا ایک پہاڑی پر کھڑا درختوں کے پار سرزمینِ روما کو تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دوست اور ہم جماعت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلے ہوئے تھے۔

اس بار اُس کے اسکول لی روزے کی انتظامیہ نے سوئٹزر لینڈ اور رُوم کی سرحد پر پکنک منانے کا انتظام کیا تھا۔

ابھی اُسے وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اُس کے اُستاد نے آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔ کریم نے اپنی اسکاٹک اسٹکس سنبھالیں اور پھسلتا ہوا ترو نیا کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں پروگرام کے مطابق اُنھوں نے کافی پینی تھی۔

اُس کے ہم جماعت کیفے میں بھی نچلے نہ بیٹھے۔ انہوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا لیکن کریم اپنے والد کے انتقال پر ابھی تک رنجیدہ تھا سو وہ اُن کے کسی شور شرابے میں شریک نہ تھا۔

گرم کافی کے تین مگ پی کر اُس نے اپنے جسم میں بھی گرمی دوڑتی محسوس کی۔ خالی مگ میز پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے ایک اُستاد نے پوچھا۔

کریم نے بانئیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے چھوٹی اُٹھل اُٹھا کر ایک مخصوص اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔

وہ ڈنر کے بعد محل کے فیملی سٹنگ روم میں بیٹھے تھے کہ اچانک فون کی کھنٹی بج اٹھی۔  
 شیتل نے ارون کو فون اٹھانے کا اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر اُس کی طرف بڑھ گیا۔  
 ”لیس آپ ریٹر۔“ شیتل نے اُسے کہتے سنا۔ ”ایک منٹ ٹھہرو میں پوچھتا ہوں۔“ وہ  
 ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر شیتل کی طرف پلٹا۔

”شیتل، تم برگامو میں کسی کو جانتی ہو؟ کیا تمہیں کسی کے فون کے انتظار تھا؟“ اُس نے  
 اپنی رسٹ وایج دیکھی۔ ”اس وقت اٹلی میں شام سات بجے کا عمل ہوگا۔“  
 شیتل کے ہاتھ میں شیمپین کا جام تھا جس کے پینے سے اُس کی پلکیں بوجھل ہو رہی  
 تھیں۔ ”میں برگامو میں کسی کو نہیں جانتی۔“ اُس نے جمائی لی۔ ”کس کا فون ہے؟“  
 ”بارڈر پولیس۔“

ارون نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ ”میرا نام ارون کپور ہے اور میں ملکہ کا پولیس  
 سیکرٹری ہوں، تم گھل کر بات کر سکتے ہو۔“ اُس نے دوبارہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا۔ ”کریم  
 کے بارے میں کوئی بات ہے شیتل، اُس کا کہنا ہے کہ اسکول سے بھی کسی لمحے تمہیں فون کیا جا  
 سکتا ہے۔ وہ تمہیں چینی طور پر تیار کرنا چاہتے ہیں۔“ ارون دوبارہ فون کرنے والے کی  
 طرف متوجہ ہو گیا۔

شیتل بھی اُچھل کر فون کی طرف لپکی اور اس سے پہلے کہ ارون کچھ کہتا اُس نے  
 ریسیور اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”لیس، میں اُس کی والدہ بول رہی ہوں، اُسے کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہ غائب ہو گیا ہے!  
 ۔۔۔ ادوہ، نہیں۔“ وہ چند لمحے ادھر سے آنے والی آواز سنتی رہی تب اُس کا بدن کانپ اٹھا۔  
 ”وہ دروازے سے باہر نکلا اور پھر واپس نہیں آیا۔۔۔؟ کیا اُسے اغوا کر لیا گیا ہے؟“

سلمیٰ لپک کر اُس تک پہنچی۔ ”بیٹھ جاؤ ہم، ریسیور، ارون کو دے دو، وہ بات کرتا



”ہے۔“

ارون نے فون لے لیا۔ ”میں ملکہ کو بتا دوں گا کہ آپ لوگ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ جونہی کوئی نشاندہی ہو، فوری طور پر مطلع کیا جائے، ہم انتظار کر رہے ہیں۔“

ارون ریسپورڈر کھ کر کاؤچ کی طرف پلٹا جس پر شیتل نیم دراز تھی۔ ”دیکھو! یہ خبر تو بہت بُری ہے لیکن ابھی کوئی بات یقینی نہیں۔ برف باری کے دوران کریم پیشاب کرنے کے لیے کیفے سے باہر نکلا اور واپس نہیں آیا۔ انہیں کریم کی اسکاٹی کیپ اور گائز کے علاوہ ایک دستاںہ بھی ملا ہے۔ انسٹرکٹر نے فوری طور پر اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی پولیس کو مطلع کر دیا ہے اور وہ لوگ برف باری کے دوران جنگل میں کریم کو تلاش کر رہے ہیں۔“

”قدموں کے نشانات ہیں؟“ سلمیٰ نے پوچھا۔

”وہ بے وقوف بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتے رہے تھے۔“ ارون نے بتایا۔

”بارڈر پولیس، انسٹرکٹر ز اور نیچے، جو کچھ بچا وہ برف باری کی نذر ہو گیا۔“

شیتل بڑبڑائی تو ارون نے اُس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ”صورت حال مایوس کن نہیں۔“ اُس نے شیتل کو تسلی دی۔ ”اطالوی پولیس نے جنگل میں ٹائروں کے نشان ڈھونڈ نکالے ہیں لیکن انہیں خون کا کوئی دھبہ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھگوان کی کرپا سے کریم ابھی زندہ ہے۔ ہمیں اب بیٹھ کر صرف انتظار کرنا ہے۔“

”انتظار!“ شیتل چیخ اٹھی۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ میں خود اطالوی وزیراعظم سے بات کرتی ہوں، میں سوس پولیس سے بھی رابطہ قائم کروں گی اور اپنی پولیس بھی وہاں بھیج سکتی ہوں۔ میں ٹیلی ویژن پر اپنے بیٹے کے لیے اپیل کروں گی۔ میں سب کچھ کروں گی، سوائے انتظار کے۔“

فون دوبارہ بج اٹھا۔ اس بار شیتل نے خود ریسپورڈر اٹھایا۔

”کریم!“ وہ چیخی۔ ”تم کہاں ہو؟ زخمی تو نہیں؟“ وہ چند ٹاپے سنتی رہی۔ ”نہیں۔“

اُس نے التجا کی۔ ”انہیں بتاؤ کہ ابھی تمہیں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جو کچھ انہوں نے کہا ہے، مجھے بتاؤ، انہیں کہو کہ میں اُن کے سارے مطالبات پورے کروں گی، میں تم سے پیار کرتی ہوں، کریم۔“

جواب ملنے کے بجائے رابطہ منقطع ہو گیا۔ شیتل نے بھی مایوس ہو کر ریسپور رکھ دیا۔  
 ”اُسے ایک پرانے چرچ میں رکھا گیا ہے۔“ اُس نے دھیمے سے لہجے میں بتایا۔ ”وہ  
 اُسے سردی سے بچاؤ کے لیے گرم دودھ دے رہے ہیں۔“  
 ”دے رہے ہیں؟“

”نقاب پوش افراد، کال ایک وارننگ تھی۔ ہمیں کہا گیا ہے کہ ہم اغوا کے بارے میں  
 ایک لفظ بھی ادا نہیں کریں گے۔ کل اغوا کنندگان اپنے مطالبات کا اعلان کریں گے۔“  
 ”بالفرض اگر رپورٹروں کو اس کی بھنک پڑ گئی تو ہم انکار کر جائیں گے۔“ ارون نے  
 شیتل کو دلاسا دیا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس اغوا کے پیچھے دہشت گرد نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے کیا  
 مطالبہ کریں گے؟ رامیر کے تمام سیاسی قیدی میں پہلے ہی رہا کر چکی ہوں۔“  
 ارون نے شیمپن انڈیل کر گلاس اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”اُسے پیو اور سو جاؤ، جب  
 فون آئے گا میں تمہیں جگالوں گا۔“

صبح چار بجے گھنٹی دوبارہ بجی، شیتل جاگ رہی تھی۔ اُس نے خود ریسپور اٹھایا اور ارون  
 کو ایکسٹینشن اٹھانے کو کہا۔

”کریم!“ اُس نے پکارا۔

لیکن دوسری جانب کریم نہیں تھا۔ ایک نئی نسوانی آواز تھی جو ٹوٹے پھوٹے لہجے میں  
 انگریزی بول رہی تھی۔

”صبح ہمارا ایک بے نام ترجمان پیرس میں بین الاقوامی پولیس کے نمائندوں کو فون  
 کرے گا۔“ عورت نے چپا چپا کر کہا۔ ”انہیں صرف یہ بتایا جائے گا کہ کریم زندہ اور ٹھیک  
 ٹھاک ہے۔ کچھ دیر ہم دوبارہ فون کر کے اپنے مطالبات دہرائیں گے۔“

”تم پوری دنیا کو بتا رہے ہو؟ مائی گاڈ، خدا کے لیے مجھے تو بتاؤ!“  
 ”اطمینان رکھیں، پورے میسج، میں اُسی طرف آ رہی ہوں۔ صرف آپ ہی اپنے بیٹے کی  
 زندگی بچا سکتے ہیں۔“

”جو کچھ بھی ہوا میں کروں۔۔۔“

”ہمارا مطالبہ بڑا سیدھا سادا ہے آپ کو تخت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔“

”دستبردار؟ کس کے حق میں؟ میرا ولی عہد تو آپ لوگوں کے قبضے میں ہے۔“

”آپ کی دستبرداری شہزادہ کریم کے حق میں نہیں ہوگی اور نہ ہی شاہی خاندان کا کوئی فرد تخت کا دعویٰ کرے گا۔“

”میں تخت پر لعنت بھیجتی ہوں۔“ شیتل ہدیانی انداز میں چیخی۔ ”مجھے میرا بیٹا چاہیے۔“

”ہم دوبارہ فون کریں گے۔“

”مجھ سے وعدہ کرو۔۔۔“ شیتل نے کہنا شروع کیا لیکن اگلے ہی لمحے اُسے احساس ہو گیا کہ وہ ڈیڈ فون میں بول رہی ہے۔ وہ کئی ٹاپے ریسور کو گھورتی رہی۔

”میں جان گئی ہوں کہ میرا دشمن کون ہے؟“ اُس نے زیر لب کہا اور ریسور رکھ دیا۔

انتظار کی گھڑیاں اُس وقت ختم ہوئیں جب صبح سے قبل دوسرا فون موصول ہوا۔  
 ”یور میجسٹی؟“ یہ مردانہ آواز تھی۔  
 ”ہیس۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کس قدر پریشان ہوں گی، میں خود بھی بیٹوں کا باپ۔۔۔“  
 ”میرا بیٹا کہاں ہے؟“  
 ”میری ساتھی نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ وہ محفوظ ہے اور میرے خیال میں آپ کے لیے یہی جاننا کافی ہے۔“

”میں اُس سے بات کرنا چاہتی ہوں؟“  
 ”وہ شمالی علاقے میں ہے۔“

”تم جانتے ہو کہ میں پہلے ہی تخت سے دستبردار ہونے کو تیار تھی۔“  
 ”مجھے آپ کا فیصلہ پسند آیا۔“

”لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میں کریم کو دوبارہ دیکھ سکوں گی یا نہیں؟“  
 ”میڈم!“ مرد کا لہجہ اچانک ہی کرخٹ ہو گیا۔ ”اس سے زندہ ملوانا میرا وعدہ ہے بشرطیکہ آپ ہماری ہدایات پر عمل کریں۔“  
 ”جو کچھ تم چاہتے ہو میں۔۔۔“

”بہت خوب، میں مختصراً کہوں گا، بحریت میں صبح ہوتے ہی آپ ٹیلی ویژن پر نمودار ہوں گی اور اعلان کریں گی کہ آپ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنے افراد خانہ کے ہمراہ فرانس یا سوئٹزرلینڈ روانہ ہو رہی ہیں۔ آپ کہیں گی کہ یہ فیصلہ آپ پر قاتلانہ حملے اور بیٹے کے اغوا کے بعد کیا گیا ہے اور آپ کو یہ بھی کہنا ہوگا کہ آئندہ آپ کبھی بحریت نہیں آئیں گی۔“  
 ”تم کون ہو؟ اور اس شاخسانے میں کس کا ہاتھ ہے؟“

”یہ غیر ضروری باتیں ہیں، جو میں کہہ رہا ہوں وہی کریں۔ آپ کا بیٹا آپ کو زندہ سلامت مل جائے گا لیکن اگر آپ نے میری ہدایات سے انحراف کیا تو بیٹا میں پھر بھی آپ کو دُوں گا۔۔۔۔۔ لیکن چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں۔“

oo

جنرل شاہد مجیب نے شہزادہ کریم کے اغوا کی خبر صبح سویرے اپنے سرہانے رکھے ریڈیو پر سنی اور اُس نے اُسی وقت سوچنا شروع کر دیا کہ وہ فوری طور پر ملکہ سے ملے گا اور اُس سے اظہارِ ہمدردی کرے گا۔ اس وقت وہ ملکہ سے ملنے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور اُن الفاظ کو ترتیب دے رہا تھا جو اُسے تازہ تازہ بیوہ اور ایک مغوی بیٹے کی ماں سے کہنے تھے۔

گھر سے روانہ ہونے سے قبل محل کے ٹیلی فون ایکسچینج میں موجود اُس کے ایک جاسوس نے اُسے فون پر بتلایا کہ روم سے ملکہ کو اغوا کنندگان کی طرف سے فون موصول ہوا ہے جس میں ملکہ سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ آئندہ شاہی خاندان کا کوئی فرد تخت کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ ملکہ نے اغوا کنندگان کا مطالبہ تسلیم کر لیا ہے۔

اور اب وہ اپنی مسلح افواج کے کمانڈر سے ملنا چاہتی تھی۔

چند لمحوں کے لیے جنرل کے ذہن میں آیا کہ ملکہ شیتل نے اُسے عارضی طور پر حکومت کا چارج سنبھالنے کے لیے بلایا ہے وہ تجربہ کار اور ملکہ کا ایک معزز فرد تھا اور اس قابل تھا کہ ان بھاری ذمے داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیتا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر ملکہ نے اُس سے مشورہ مانگا تو وہ اُسے دستبردار ہونے کے لیے ہی کہے گا۔

جنرل اپنی لیویزین سے اتر کر ملکہ کے ذاتی اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ سیلون کا دروازہ کھلا تھا۔ جنرل سیدھا ملکہ تک پہنچا۔

”یور میجسٹی!“ اُس نے اپنی آواز میں درد سموتے ہوئے کہا۔ ”بڑی غمگین اور غمین“

صورت حال ہے، کیا اغوا کنندگان نے دوبارہ آپ سے رابطہ قائم کیا ہے؟“

”ہاں۔“ شیتل نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ”ارون، جنرل کو تفصیل سے

بتاؤ۔“

ارون نے تمام بات چیت سے جنرل کو آگاہ کیا۔ بعض مقامات پر جنرل نے سوالات

بھی کیے، جن کا جواب ارون نے ہی دیا۔

”اب تمہارا مشورہ کیا ہے جنرل؟“ شیتل نے دریافت کیا۔

”مجھے ڈر ہے کہ آپ کو دستبردار ہونا پڑے گا اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا، میڈم۔“

اس سے پہلے کہ جنرل یا شیتل میں سے کوئی کچھ اور کہتا ارون دونوں کے درمیان

آ گیا۔

”آپ کے آنے کا شکریہ جنرل، آپ کے مشورے کا خیال رکھا جائے گا اور ساتھ ہی

تازہ ترین پیش رفت سے بھی آپ کو آگاہ کیا جاتا رہے گا۔“

○○

ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر اُس کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ اُس نے فون بند کرنے کا مشورہ رد کر دیا تھا۔ ”ہو سکتا ہے اگلا فون انہی کا ہو؟“ وہ اصرار کرتی اور سلی اور ارون ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔

اس عرصے میں بہت سے فون موصول ہوئے تھے۔ سربراہان مملکت، اُن کی بیگمات، سفراء اور دوست احباب اُس سے برابر ہمدردی کر رہے تھے۔ پیتا نے لوزا نے سے اور گوتم نے ننی دہلی سے فون کیا تھا۔ سوہن اور وجیتا کے علاوہ بمبئی کے کچھ پرانے دوستوں نے بھی اُس کی خبر گیری کی تھی۔ بعض نے خود آنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن شیتل نے سب سے معذرت کر لی تھی۔

پریس والے الگ پریشان کر رہے تھے۔ ارون نے ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں شیتل نے اخباری نمائندوں کے سوالوں کے جوابات دیے۔  
 ”آپ کیا محسوس کر رہی ہیں، ملکہ عالیہ؟“ ایک نمائندے نے سوال کیا۔  
 ”تمہارے خیال میں میں کیا محسوس کر رہی ہوں گی، گدھے کے بچے؟“ شیتل بُری طرح چیخی۔

سلی اور ارون نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ سزا ختم کرنے کا وقت تھا۔ پریس کانفرنس کے اختتام کا اعلان کرنے کے بعد ارون نے دونوں کلائیوں سے پکڑ کر شیتل کو اٹھا لیا۔ وہ جھولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی ایم سوری، شیتل، یہ غلطی میری تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ تمہیں اس قدر پریشان کریں گے، تم سو جاؤ، میں جاگ رہا ہوں جو نبی کوئی اہم فون آیا تمہیں جگالوں گا۔“  
 سلی اُسے کھینچ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور زبردستی اُسے صوفے پر لٹا دیا۔ کچھ دیر وہ صوفے پر لیٹی بسکیاں لیتی رہی، اور پھر سو گئی۔



جانے کب، ایک مضبوط ہاتھ نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھجھوڑا۔ شیتل ادھ گھلی آنکھوں سمیت اٹھ بیٹھی، وہ ارون تھا۔ اُس نے ٹیلی فون کا ریسورس کی طرف بڑھا دیا۔

”پیرس سے اریبہ کا فون ہے۔“

وہ چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے ریسور کو دیکھتی رہی بالآخر اُس نے ریسور لے لیا۔ دوسری جانب اریبہ نہیں ریکس تھا۔ وہ بولتا رہا اور شیتل سنتی رہی۔ وقفے وقفے سے وہ سلمیٰ اور ارون کا جائزہ بھی لیتی رہی۔ ایک آدھ بار اُس نے بیچ میں ہوں ہاں کی اور ریسور رکھ دیا۔ سلمیٰ اور ارون فون پر ہونے والی بات چیت کی تفصیل جاننے کے مضطرب تھے۔

”ریکس ایک زمانے میں اطالوی ریڈ بریگیڈ سے وابستہ رہا ہے۔“ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا۔ ”لیکن اریبہ سے ملنے کے بعد اُس نے ریڈ بریگیڈ چھوڑ دیا۔ اسے اغوا کنندگان کے بارے میں کوئی خبر ملی ہے۔ عرصہ پہلے ایک ادھیڑ عمر شخص نے میلان کی ایک کاؤنٹیس سے شادی کے لیے ریڈ بریگیڈ چھوڑ دیا تھا اور بیوی کی آڑ میں دوسرے دھندوں میں مصروف ہو گیا تھا۔“

”کون سے دھندے؟“ سلمیٰ نے بے قراری سے پوچھا۔

”وہ پورے یورپ کو سوشلسٹ بنانا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے پروپیگنڈے کے لیے رقم چاہیے اور وہ اس رقم کے حصول کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔“

”اُس کا نام کیا ہے؟“

”سینور وینڈی کیٹر۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ”ریکس نے بعض دوستوں کی معرفت اُس سے رابطہ قائم کیا ہے۔ سینور نے قبول کچھ نہیں کیا لیکن اُس نے ریکس کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس معاملے پر بات چیت کے لیے فوراً روم پہنچے۔“

”ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو؟“ سلمیٰ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”ہم اُس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟“ ارون نے کہا۔

”کچھ نہیں، اریبہ فوری طور پر اُسے اور لی ائرپورٹ لے جا رہی ہے تاکہ وہ روم کی اگلی

فلائٹ پکڑ لے۔“

ہاتھ ب میں لیٹی شیتل نے نگاہیں اٹھا کر دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا ابھی لوگوں کے سامنے جا کر اپنی دستبرداری کا اعلان کرنے میں بارہ گھنٹے باقی تھے۔

ٹھیک اُسی وقت محل کے ایک زیر زمین کمرے میں کیرامین اردن کی نگرانی میں اپنے کمرے اور لائسنس فکس کر رہے تھے۔ مائیکروفون وغیرہ چیک کیے جاتے تھے۔ مہاگنی کی ایک میز کے عقب میں صرف ایک کرسی رکھی گئی تھی جب کہ میز پر دو ننھے منے پرچم لہرا رہے تھے۔ ایک بحریہ کا قومی پرچم تھا اور دوسرا ملکہ کا ذاتی پرچم۔

”یہ چند لمحوں کا کھیل ہوگا۔“ کچھ دیر قبل اردن نے اُسے یقین دلایا تھا۔

”اس کے بعد ہم بچوں کو اکٹھا کریں گے اور وہاں چلے جائیں گے، جہاں ہم محفوظ ہوں گے، جان۔“ شیتل نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ ”میں سلکون چاہتی ہوں، جس کے لیے سالوں سے ترس رہی ہوں۔“

گھڑی نے بارہ بج کر تین منٹ بجائے تو وہ ب سے نکل آئی۔ اُس نے ایک گاؤن پہنا اور اپنی میز پر آ بیٹھی۔ جو کچھ وہ کر رہی تھی اُس میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ وہ دروازہ کھلنے اور اپنی جانب آنے والے قدموں کی آہٹ بھی نہ سن سکی تھی۔

”میرے خیال میں تو تم آرام کر رہی تھیں؟“ سلمیٰ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ یا واپس باہر چلی جاؤ۔“ شیتل نے رُ دکھے پن سے اپنا پن سلمیٰ کی طرف اٹھایا۔ ”تم دیکھ نہیں رہیں، میں لکھ رہی ہوں، اپنی دستبرداری کی تقریر۔“

”یہ صبح بھی لکھی جاسکتی ہے۔“ سلمیٰ باقاعدہ دادی لٹاں کا کردار ادا کر رہی تھی۔ ”میں

کہتی ہوں اب سو۔۔۔“

سلمیٰ کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کمرہ فون کی کھنٹی سے گونج اٹھا۔ شیتل نے پن میز پر پھینکا

اور بھاگ کر ریسور اٹھا لیا۔

”ریکس! کیا ہوا؟ کریم کہاں ہے؟ وہ محفوظ تو ہے؟“ ایک ہی سانس میں وہ کئی سوال پوچھ گئی تھی۔

”وہ ہے تو وینڈی کیئر کے آدمیوں کے پاس لیکن نئی شرائط کے طے ہونے تک اُس نے اُس جگہ کنے بارے میں بتانے سے انکار کر دیا ہے جہاں کریم موجود ہے۔“  
 ”نئی شرائط؟“ شیتل نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، کیش پچاس لاکھ ڈالر، سوئس فرانکس کی شکل میں کل دوپہر سے پہلے اُسے فراہم کرنے ہیں۔“

”پچاس لاکھ ڈالر۔“ شیتل کی سانس اکٹنے لگی۔ ”میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں گی؟“

”زیورات، خزانہ، آرٹ کے نمونے؟“ ریکس نے پوچھا۔  
 ”سب کچھ ہے لیکن انہیں کیش کرانے میں وقت لگے گا اور پھر یہ کوئی خفیہ بات نہیں رہے گی۔“

”تو پھر میں انہیں کیا بتاؤں؟“  
 ”یہی کہ میں اُن کی سابقہ شرائط ماننے کو تیار ہوں، میں دستبردار ہو جاؤں گی۔“ شیتل نے سلمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اچانک شیتل کا چہرہ چمک اٹھا۔ اُس کی آنکھیں روشن ہو گئیں، ریسور اُس نے مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔

”نہیں۔۔۔ ٹھہرو، ریکس۔۔۔ ایک منٹ۔“ وہ فون میں چلائی۔ ”میں رقم کا انتظام کر سکتی ہوں اور کسی کو کبھی پتا بھی نہیں چلے گا کہ یہ کہاں سے آئی!“ وہ ہسٹیریا کی انداز میں ہنسی کیسا عجیب مذاق ہے؟“

”کیا ہوا؟“ ریکس نے دوسری سمت سے دریافت کیا۔  
 ”بعد میں بتاؤں گی، وینڈی کیئر کے پاس جاؤ اور اُسے بتاؤ کہ میں کریم کے بدلے پچاس لاکھ ڈالر ادا کرنے کو تیار ہوں، خدا حافظ۔“

ریسیور رکھ کر وہ سلمیٰ کی طرف پلٹی۔ اُس کے انگ انگ سے سرشاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کوئی سوال نہیں، سلمیٰ۔ ارون کو ڈھونڈو، اُسے کہو کہ فوری طور پر تیاری کرے، میں جہاز کا انتظام کرتی ہوں اور ہاں اُسے کہنا کہ ٹاپ کوٹ بھی لیتا آئے، زیورچ میں خاصی سردی ہوگی۔“

اُس نے ضروری فون کیے اور پھر زیورچ روانہ ہو گئی۔ کریڈٹ سوئس بینک کے ڈائریکٹر نے رامیر کی قانونی وارث ہونے کے ناتے رامیر کے تمام خفیہ اکاؤنٹ شیتل کے نام منتقل کر دیے اور ایک گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلے تو ارون کے ہاتھ میں موجود بریف کیس سوئس فرانکس کی شکل میں پچاس لاکھ ڈالر سے لبا لب بھرا ہوا تھا۔

”تم میلان جا رہے ہو، ارون۔“ شیتل نے ریکس سے بات کرنے کے بعد ارون سے کہا۔ ”ریکس انٹرنیشنل پر تمہارا منتظر ہوگا۔ اُسے رقم دینا اور انشاء اللہ تعالیٰ کریم دوپہر سے قبل میری بانہوں میں ہوگا۔“

”تم ریکس کو صرف اریبہ کے محبوب کی حیثیت سے جانتی ہو، وہ رقم لے کر بھاگ گیا تو کیا ہوگا؟“ ارون نے کہا۔

”آں۔۔۔“ شیتل چونکی لیکن اگلے ہی لمحے پُرسکون ہو گئی۔ ”ابھی میرے پاس ایک راستہ باقی ہے، دوپہر کو میں تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دوں گی۔“

ارون چلا گیا لیکن شیتل کو انجانے وسوسوں میں مبتلا کر گیا۔ واقعی ریکس اگر رقم سمیت فرار ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ کچھ دیر وہ اس معاملے پر غور کرتی رہی، بالآخر جھٹکے سے اٹھی اور میک آپ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ایک ہفتہ پہلے تک مجھے علم ہی نہیں تھا کہ رامیر کے خفیہ اکاؤنٹس میں اتنی بڑی رقم موجود ہے۔ میں سمجھوں گی کہ ڈائری میری نظر سے گزری ہی نہیں۔“ شیتل نے خود کو تسلی دی اور میک آپ میں مصروف ہو گئی۔ ٹی وی پر آنے کے لیے چوکتا درست کرنا ضروری تھا۔

میک آپ سے فارغ ہو کر اُس نے وہ تقریر اٹھالی جس میں اُسے اپنی دستبرداری کا اعلان کرنا تھا۔ تقریر پڑھتے پڑھتے ایک اور خیال اُس کے ذہن میں آیا۔ اگر انہوں نے رقم لے کر بھی کریم کو رہا نہ کیا تو پھر۔۔۔؟

لیکن وہ اس موضوع پر زیادہ دیر سوچ نہ سکی۔ فون بج اٹھا تھا۔ اس نے فوراً ریسورٹ اٹھا لیا۔

”تمی!“ کریم کی زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ ”آپ کیسے ہیں تمی؟“  
 ”تم کہاں ہو، بیٹے؟“ شیتل کی آواز بھڑک اُٹی۔ ”تمہارے ساتھ کون ہے؟“  
 ”انکل ارون اور انکل ریکس تمی۔“ کریم نے جواب دیا۔ ”آپ رورہی ہیں، تمی؟“  
 ”آئی ٹو یو، کریم۔“ شیتل اسی قدر کہہ سکی اور پھر اُس کے حلق سے سسکیاں آزاد ہونے لگیں۔

”شیتل!“ دوسری جانب سے ارون کی آواز اسے سنائی دی۔ ”کریم رہا ہو گیا ہے، جہاز ٹیک آف کے لیے تیار ہے۔ ایک غیر ملکی نے وینڈی کیٹر کو کریم کے اغوا کے لیے بڑی مقدار میں سونے کی پیش کش کی تھی لیکن ہم نے اُس سے بڑی پیش کش کر کے کریم کو رہا کروا

لایا۔ ذاتی طور پر وینڈی کیٹر کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ بحریت پر تم حکومت کرتی ہو یا یورپ، اُسے اپنے پروپیگنڈے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ اُس نے بولی لگائی اور ہم جیت گئے۔“

”میں سمجھ گئی ہوں کہ وہ غیر ملکی کون ہو سکتا ہے؟“ شیتل نے بدستور سسکتے ہوئے کہا۔

”ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے، فی الحال تم تیاری کرو، تمہیں اور کریم کو اکٹھے ٹیلی ویژن پر پیش ہونا ہے۔۔۔ اور ہاں کسی بالکونی کے قریب نہ جانا۔۔۔“

ریال کے شاہی محل سے بذریعہ کار ایک گھنٹے کے فاصلے پر بنے ہوئے ایک ساحلی محل میں جنرل شاہد مجیب نے اپنائی وی سیٹ آف کیا اور ڈرائیور کو سوٹ کیس بلٹ پروف لیوزین کی ڈکی میں رکھنے کی ہدایت کی۔ اُس کی زبان پر ہدایات اور دل میں گالیاں تھیں جو شیتل کے لیے نکل رہی تھیں۔

”کُنیا! گندی دوغلی کُنیا۔“

صبح سویرے اُس نے ملکہ سے دوسری ملاقات کی اجازت طلب کی جو اُسے مل گئی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ دستبرداری کے اعلان کے وقت ملکہ کی ٹرسی کے عقب میں کھڑا ہو تاکہ عوام کو اُس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے اور وہ اُسے کیئر فیکر کے طور پر قبول کر لیں لیکن ملکہ نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر انکار کر دیا تھا۔

”صرف میں اور میرے بچے ہوں گے۔“ ملکہ نے کہا تھا۔ ”یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے اور ہم اس میں کسی کو شریک نہیں رکھنا چاہتے۔ میری خواہش ہے کہ کریم واپس آ جائے تو میں فرانس یا سوئٹزرلینڈ چلی جاؤں۔“

اُس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ جنرل کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ کوئی ایسی بات جانتی تھی جس کا اُسے علم نہیں تھا۔ جنرل نے سینور وینڈی کیٹر سے رابطے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا مگر اُس کے آدمیوں نے بتایا کہ لڑکانی الحال انہی کے قبضے میں ہے۔

محل سے گھر آتے ہی اُس نے اپنا سامان تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ بحری جہاز کے ذریعے ترکی اور پھر وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے کسی نامعلوم مقام کو جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن ابھی وہ حالات کا مزید جائزہ لینا چاہتا تھا۔

اور پھر دوپہر کو وہ ہنستی مسکراتی ٹیلی ویژن اسکرین پر نمودار ہوئی۔ کریم اُس کے ہمراہ



تھا۔ مجیب نے اُسے بُری سی گالی دی جس وقت وہ اُس سے ملا تھا، اُسے کریم کی واپسی کا علم ہو چکا تھا لیکن اُس نے جنرل کو اعتماد میں لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

اُس کے زندگی سے بھرپور چہرے سے جنرل سمجھ چکا تھا کہ اُس کی بازی اُلٹ گئی ہے۔

نصف گھنٹے بعد وہ اپنے سامان سمیت بندرگاہ پر موجود تھا۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس جنرل کو یقین تھا کہ اسے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ اُس نے اپنے سوٹ کیس، پورٹروں کے حوالے کیے اور فریئر کی طرف بڑھا جو اُسے ترکی لے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اُسی وقت تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک شخص نے بڑھ کر جنرل کا راستہ روک لیا۔

”جنرل مجیب!“ آنے والے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنے آپ کو زیر حراست سمجھیں۔“

جنرل کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے مُرنے کی کوشش کی اور اُسی وقت بندوق کی ایک ٹالی اُس کی پشت سے آگئی۔ وہ محض کسمسا کر رہ گیا۔ اُس نے اپنی فوجی قوتِ ارادی کو مجتمع کیا اور تھری پیس سوٹ والے کو مخاطب کیا۔

”کس کے حکم سے؟“

”ملکہ کے حکم سے۔“

”لیکن کیوں؟“

”یہ ہمارا معاملہ نہیں۔“ لیڈر نے جواب دیا۔ ”ہم فوری طور پر تمہیں ریال لے جا رہے ہیں۔“ اس نے جیب سے ایک خط نکال کر جنرل کے حوالے کر دیا۔ ”ملکہ نے آپ کے لیے یہ خط دیا ہے۔“

جنرل نے خط لے لیا لیکن خاموشی سے آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ جس کی طرف لیڈر نے اشارہ کیا تھا۔ دورانِ نقل بردار، جنرل کے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ جونہی کار آگے بڑھی، جنرل نے خط کھول لیا۔

”مائی ڈیئر جنرل!“

جس صورت حال سے تم اس وقت دوچار ہو میں خود بھی اس پر افسوس

کا اظہار کرتی ہوں۔

تم خود سوچو کہ جس شخص پر تم نے ایک بار اعتماد کیا ہو، تم سے غداری کر جائے تو کیا حالت ہوتی ہے؟ جب تمہیں علم ہوگا کہ میلان میں ہمارے مشترکہ دوست نے تم سے غداری کی ہے تو تمہیں اس درد کا صحیح اندازہ ہوگا۔ جب مجھے علم ہوا کہ سینورویڈی کیٹراؤس قیت پر میرا بیٹا مجھے واپس کر سکتا ہے جو تم اُسے ادا نہیں کر سکتے تو میں نے اپنے لختِ جگر کو خرید لیا۔

مجھے اس پر بے حد افسوس ہے کہ جب میں تخت پر بیٹھی تو میں نے عہد کیا تھا کہ میرے ملک میں کوئی سیاسی قیدی نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی پر تشدد کیا جائے گا۔ میری سچائی کا اندازہ تمہیں اُس روز ہو گیا ہوگا جب میں نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔

ذرا میرے درد کا تصور کرو جو مجھے اپنا عہد اتنی جلد توڑنے پر ہوا ہے۔ تم، جنرل شاہد مجیب، میرے پہلے سیاسی قیدی ہو کیونکہ اس سے پہلے میں نے جن حملہ آوروں کو گرفتار کیا ہے وہ کرائے کے فوجی تھے جنہیں تم نے اور شہزادی عذرا نے رقم فراہم کی تھی۔

را میر کے قیدیوں کی طرح تمہارے مقدمے کی کبھی سماعت نہیں ہوگی لیکن خدا کا شکر ادا کر دو کہ میں رحم دل ملکہ ہوں لہذا تم پر تشدد دہی نہیں کیا جائے گا۔

ہرا میریل میجسٹی شیتل رامیر

ملکہ بحریت۔“

محل کے زیر زمین کمرے میں اردن کپڑوں کے پلیٹ فارم پر کھڑا اُن اخباری نمائندوں سے مخاطب تھا جن سے کمرہ کھینچ بھرا ہوا تھا۔  
 ”آپ لوگ ملکہ شیتل کی تقریر سن چکے ہیں، پرنس کریم کے اغوا کے بارے میں اب

آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

سوال گولی کی سی تیزی رفتار سے آیا۔

”رقم کہاں سے آئی تھی؟“

”قریبی دوستوں سے جو اپنا نام صیغہ راز میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔“

”کیا شہزادہ واپس سوئٹزرلینڈ جائے گا؟“

”ہاں، لیکن میں صحیح تاریخ نہیں بتا سکتا۔ اس مرتبہ اُس کے تحفظ کے لیے سیکرٹ سروس کے مسلح افسران بھی ہوں گے۔“

”ملکہ کا فوری پروگرام کیا ہے؟“

”کل فجر کے وقت ملکہ اپنے بچوں کے ہمراہ محل کی مسجد میں جائیں گی جہاں اُن کی تاجپوشی ہوگی۔“

”تصویریں بنانے کی اجازت ملے گی؟“

”نہیں، ملکہ کی خواہش ہے کہ تقریب سادگی سے ہو کیونکہ وہ حال ہی میں یتیم ہوئی

ہیں۔“

”کوئی سیاسی منصوبہ بندی؟“

”آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہماری جنوب مغربی سرحد پر ایک سرحدی لڑائی کے بارے میں سعودی عرب سے تنازعہ چل رہا ہے۔ دونوں ملک اُس کے دعوے دار ہیں۔ پیرس میں شاہ کے ساتھ پیش آنے والے افسوس ناک حادثے سے قبل شاہ رامیر اور شاہ فہد کے اعلیٰ

سطھی نمائندوں کے مابین بات چیت ہوئی تھی۔ جب کہ دونوں شاہوں کے درمیان ملاقات جوہلی تقریبات کے بعد ہونا طے پائی تھی۔ شاہ فہد، ریال کا دورہ کرنے والے تھے لیکن صورت حال کے پیش نظر انہوں نے کمال مہربانی سے اپنا دورہ کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دیا تا کہ ملکہ شیتل مکمل طور پر صورت حال کو سمجھ سکیں اور اب ملکہ عالیہ نے شاہ فہد کو ریال کے دورے کی دعوت دی ہے اور ہر میجسٹی پرسوں ریال پہنچ رہے ہیں۔“

”تصویریں؟“

”شاہ کی آمد اور روانگی پر آپ لوگ موجود ہوں گے لیکن بات چیت قطعی نہیں ہوگی۔“

”انسٹریووز؟“

”معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ یہ بھی ناممکن ہے، نہ ہی کسی بیان کے اجراء کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ جو بھی طے ہوگا مناسب وقت پر آپ کے علم میں آجائے گا۔۔۔ اب خدا حافظ۔“

گولڈن لائن روم میں شاہ فہد اور ملکہ شیتل تنہا آئے سانسے موجود تھے۔

شاہ کا خصوصی طیارہ آج صبح ہی ریال ایر پورٹ پر اترتا تو ملکہ شیتل نے خود اُن کا استقبال کیا۔ شیتل نے شاہ سے ملاقات کی بھرپور تیاری کی تھی اور شاہ کی زندگی کے بارے میں کئی فلمیں بھی دیکھی تھیں تاکہ ان کی عادات و اطوار کے بارے میں آگاہ ہو سکے۔ جنرل ٹوری سے جسے اُس جنرل مجیب کی جگہ ترقی دے کر مسلح افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا، اُس نے فوجی صورت حال پر بھی تبادلہ خیال کیا تھا۔

ہوائی اڈے سے دونوں حکمران ایک ہی گاڑی میں محل پہنچے۔ پہلے اُن کے معاونین نے آپس میں مذاکرات کیے جب کہ بعد میں سربراہی ملاقات ہوئی۔

دوپہر کے کھانے پر بات چیت کی نوعیت رسمی تھی لیکن جب اصل معاملے پر بات چیت شروع ہوئی تو شیتل کو اندازہ ہوا کہ رسمی طور پر نرم نظر آنے والے شاہ فہد اصولوں کے بڑے سخت تھے۔

”بحریت کا مؤقف اب بھی وہی ہے جو میرے مرحوم شوہر کا تھا۔“ شیتل نے ایک دلاویز مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بتایا تھا ”ہم اب بھی اس علاقے کے دعوے دار ہیں۔“

”تو پھر میں آپ کے لیے صرف افسوس کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔“ شاہ نے بڑے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔ ”آپ کی حکومت نے میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں چھوڑا کہ میں اپنی فوجوں کو اس علاقے پر حملے کا حکم دوں تاکہ اس بیوقوفانہ تنازع کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔“

”آپ کو علم ہوگا کہ بحریت دُنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جو مکمل طور پر مسلح ہیں۔“ شیتل نے انہیں یاد دلایا ”اُس پر حملہ اتنا آسان نہ ہوگا۔“

”آپ حقائق بیان کرنے میں غلطی کر رہی ہیں، ملکہ عالیہ، یہ درست ہے کہ بحریت،

بھارت سمیت دُنیا کے مختلف مُلکوں سے اسلحہ حاصل کرتا رہا ہے لیکن بحریت دُنیا کے مسلح ترین ممالک میں سے نہیں۔ میری انٹیلی جنس کی اطلاع کے مطابق خرید جانے والا تمام اسلحہ مسٹر گوتم نامی ایک بھارتی کے توسط سے افریقی ممالک کو منتقل کیا جاتا رہا ہے جس کے صلے میں آپ کے مرحوم شوہر نے کروڑوں ڈالر کمائے ہیں۔۔۔ کیا میں آپ کو یاد دلاؤں کہ دلی عہد شہزادے کی رہائی کے لیے بھی رقم اُسی خفیہ اکاؤنٹ سے ادا کی گئی ہے۔۔۔ سو میں یہ کہنے پر بھی مجبور ہوں کہ آپ بھی اس کھیل میں برابر کی شریک تھیں۔“

غصے کے بارے شیتل کے رخسار جل اُٹھے تھے۔ ”مجھے ان باتوں کا علم نہیں تھا، شاہ معظم۔“

”اب تو ہے، بلکہ آپ اُسے استعمال بھی کر چکی ہیں۔“ شاہ نے مسکرا کر اُس کے زخموں پر نمک چھڑکا۔ ”خیر مجھے اس سے غرض نہیں، میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے دفاع میں خاصے بڑے بڑے شگاف موجود ہیں، میری فوجیں آپ کے خلاف جنگ بہ آسانی جیت سکتی ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ دو اسلامی برادر مُلک ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں اس لیے فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔“

شیتل کی نیلی آنکھیں جھجک گئیں۔ وہ خاموشی سے صورتِ حال پر غور کرنے لگی۔ شاہ کا کہنا درست تھا۔ واقعی بحریت اس قابل نہیں تھا کہ وہ سعودی فوجوں کی راہ روک سکتا۔

”ٹھیک ہے۔“ بلا آخر شیتل نے پلکوں کی چلن اٹھائی۔ ”میں اپنی وزارت کی کونسل سے اس معاملے پر بات چیت کروں گی اور آپ کو دو ہفتوں کے اندر اندر جواب سے مطلع کر دوں گی۔“

شاہ فہد کے ہونٹوں پر ذومعنی مسکراہٹ نیر گئی۔

شیتل اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئی لیکن وہ کبھی کیا سکتی تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بزدل بادیا۔ جنرل ثوری دروازہ کھول کر فوراً ہی اندر آ گیا۔

”ہزیمجی روانہ ہو رہے ہیں۔“ شیتل بولی۔ ”میں ہال میں اُن سے ملاقات کروں گی۔ مسٹر اردن کپڑا کو آگاہ کر دیا جائے کہ کوئی بیان جاری ہوگا نہ تصویریں بنیں گی۔“

ڈنر کے بعد وہ لوگ فیملی سٹنگ روم میں بیٹھے کپ شپ کر رہے تھے۔ ارون اور سلی بھی موجود تھے۔

”نمی!“ یکا یک کریم پکار اٹھا۔ سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ”آپ کو یاد ہوگا آپ نے ایک بار سوئٹزر لینڈ میں مجھ سے کہا تھا کہ ایک دن بحریہ، امریکہ سے بہتر ہوگا، آپ نے کہا تھا کہ طلبہ، فن کار، ادیب، شاعر، اخبار نویس، سیاست دان سب آزاد ہوں گے، جو وہ چاہیں گے کریں گے، تمام جیلوں کے دروازے کھول دیے جائیں گے، کوئی سیاسی قیدی نہیں۔۔۔“

”ایک منٹ کریم۔“ شیتل نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ ”میں اپنے پہلے سیاسی حریفوں کو قید میں ڈال چکی ہوں۔“

”جنرل حبیب؟ وہ حملہ آور؟ وہ ایک الگ کیس ہے۔“

”ممکن ہے اور بھی ہوں۔“ شیتل نے مستقبل کی طرف اشارہ کیا۔

”چند ایک، اور اُن کی توقع ترقی یافتہ سے حرفی یافتہ ممالک میں بھی کی جاسکتی ہے۔“ کریم نے پُر جوش انداز میں کہا۔ ”ظالم سیکرٹ پولیس پر پابندی لگائی جا چکی ہے۔ تشدد کرنے کو ممنوع قرار دیا جا چکا ہے۔ فوج جانتی ہے کہ آپ اب قانونی ملکہ ہیں۔۔۔“ اچانک وہ خاموش ہو گیا، چند ثانیے توقف کے بعد اُس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”۔۔۔ ڈیڈی بھی اچھے حکمران تھے۔ لیکن اُن کی سوچ ذرا مختلف تھی۔ میں اور می اُن سے خاصے الگ ہیں، سوچ کے معاملے میں بھی اور۔۔۔“

ساتھ والے کمرے سے آنے والی فون کی کھنٹی کی آواز نے کریم کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

”اس وقت؟“ ارون نے گھڑی دیکھی۔ ”میں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ ہمیں

ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”دیکھ لو ذرا۔“ شیتل نے اُسی سے کہا۔

ارون دوسرے کمرے میں چلا گیا واپسی چند ثانیوں بعد ہوئی۔ ”تمہارا فون ہے، شیتل۔“ اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”گوتم نیلامبز، دہلی سے۔“ سلیٹی اور کریم نے چونک کر شیتل کو دیکھا۔ ”وہ تمہاری کال کے جواب میں فون کر رہا ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ شیتل نے رکھائی سے کہا۔

”کیا میں درمیانی دروازہ بند کروں؟“ ارون نے پوچھا۔

”نہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم سب سنو۔“

تمام لوگوں نے شیتل کی تقلید کی۔

”گوتم۔“ شیتل نے کھٹکتی ہوئی آواز میں بات چیت کا آغاز کیا۔ ”جلد فون کرنے کا شکریہ۔“ اُس کے جواب پر شیتل نے تہقہہ لگایا۔ ”نہیں گوتم، فون کی وجہ بحریت میں آزادانہ انتخابات نہیں، ابھی لوگ اس کے لیے تیار نہیں۔“ وہ چند لمحوں سنبھلتی رہی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”بس کرو اور سنجیدہ ہو کر میری بات سنو۔۔۔۔۔ وہی ہتھیاروں کی خریداری کے معاملے میں۔۔۔۔۔ میں اپنی غلطی تسلیم کر رہی ہوں، ناراض مت ہو، صرف یہ بتاؤ کہ تم جلد سے جلد کب تک میرے پاس پہنچ سکتے ہو؟“ اُس نے سر ہلایا۔ ”اور ڈیلیوری کی تاریخ؟۔۔۔۔۔ ہاں ظاہر ہے۔۔۔۔۔ مزید ٹیکنیشنز، مشین اور انسٹرکٹرز بھی۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔ میں انتظار کروں گی۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔“ اُس نے ریسوررکھ دیا۔

شیتل کو علم تھا کہ تمام لوگ بڑے غور سے اسے دیکھ رہے ہوں گے اور وہ واقعی اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سے پہلے کریم تک پہنچی۔ ”تم نہیں سمجھ سکو گے، بیٹے۔“ اُس نے کریم کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سرحدوں پر خطرات منڈلا رہے ہیں اور ایک ملکہ کی حیثیت سے اُن کے تحفظ کی ذمہ داری میری ہے۔“

کریم پلکیں چھپکائے بغیر اُسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھ پر اعتماد کرو، میرے ولی عہد۔“ اُس نے التجائی۔ ”میں نے سوئٹزرلینڈ میں تم سے جو کہا تھا وہ پورا ہو گا لیکن تمام اصلاحات وقت مانگتی ہیں۔ اس وقت صرف یہ بات یاد رکھو



کہ میں کمزور پڑی تو دشمن مجھے اور بحریہ کو کچا چبا جائیں گے۔“  
 ”اور وہ وعدے جو لوگوں سے آپ نے کیے تھے؟“ کریم نے بالآخر زبان کھولی۔  
 ”وہ ضرور پورے ہوں گے، میری جان، میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی زندگی میں کبھی  
 اُن کی رقم پُر کر سوئٹزرلینڈ کے ٹخفہ اکاؤنٹس میں جمع نہیں کراؤں گی۔“  
 ”لیکن اگر تم ہتھیار خریدنا چاہتی ہو تو اُن ٹخفہ اکاؤنٹس کو استعمال کیوں نہیں کرتیں؟“  
 ارون نے پوچھا۔

”ناممکن ہے، اگر میں نے دوبارہ اُن اکاؤنٹس کو استعمال کیا تو یہ بات ٹخفہ نہ رہ سکے گی  
 اور پوری دنیا کو علم ہو جائے گا کہ رامیر اور گوتم کیا کرتے رہے ہیں؟ گوتم کی میری نظر میں کوئی  
 حیثیت نہ سہی لیکن کل آوارہ ہونے کے باوجود میں اپنے مرحوم شوہر کو رسوا نہیں کر سکتی۔“  
 ”تمہیں بغاوت کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔“ ارون نے اُسے یاد دلایا۔ ”پہلے بھی قبائلی  
 صرف ہتھیاروں کے حصول کی وجہ سے رامیر کے مخالف ہوئے تھے۔“  
 ”انھیں کچل دیا جائے گا۔“ شیتل نے کہا۔ جو نبی الفاظ ختم ہوئے کریم نے جھٹکے سے  
 خود کو ماں کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن شیتل نے بڑھ کر دوبارہ اُسے تھام لیا۔ ”نہیں میرے  
 بیٹے۔“ اُس کا انداز اب بھی التجائیہ ہی تھا۔ ”تمہاری ماں کے پاس ٹھوس وجوہات موجود  
 ہیں۔“

”میں سُن چکا ہوں۔“ کریم چیخا۔ ”اور وہ میری تسلی کے لیے کافی نہیں۔“ اُس نے  
 سسکنا شروع کر دیا۔ ”میں آپ کو دیکھنا تک نہیں چاہتا، میں آپ سے نفرت کرنے لگا  
 ہوں۔“

”بیٹے ماؤں سے نفرت نہیں کیا کرتے، میرے بچے۔“ شیتل نے اُسے تھپکا۔ ”کل تم  
 اسکول واپس چلے جاؤ گے، وہاں جا کر تاریخ پر زیادہ زور دینا پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ  
 حکمرانی کیسے کی جاتی ہے؟“ وہ ارون کی طرف مڑی۔ ”اِس کا خیال رکھنا، ارون، جب تم  
 واپس آؤ گے تو ہم اس مسئلے پر مزید بات چیت کریں گے۔“

”میں واپس نہیں آؤں گا۔“ شیتل نے ارون کے الفاظ ہم کی طرح شیتل پر گرے۔  
 ”اوہ، تو تم بھی؟“ وہ ایک لمحے کو لڑکھرائی لیکن فوراً ہی سنبھل گئی۔ ”تم کیا کرو گے؟“

”اور کچھ نہیں تو کم از کم سکون سے سوؤں گا تو سہی۔“ اردن نے جواب دیا۔ ”آؤ کریم، چلیں۔“

شیتل نے کریم کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”میں آپ سے پیار کرتا ہوں، مچی۔“ کریم اب بھی سک رہا تھا۔

”میں بھی۔“ شیتل کی آواز بھڑا گئی۔ ”لیکن اس وقت اپنی محبتوں کا اظہار نہیں کر سکتی،

اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔“ اُس نے کریم کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

”وہ دن جلد آئے گا جب ہم پھر ایک ہوں گے۔“ شیتل نے زیر لب کہا اور دوسری

طرف منہ کر کے سسک پڑی۔

رات کے سٹائے میں دونوں تنہا ویران لان میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔  
 ”کیا تم بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہو، سلی؟“ شیتل نے خاموش فضا کو ذرا ہم برہم کرنے میں پہل کی۔

”تم نے کبھی تتلیاں پکڑنے والے بچے دیکھے ہیں شیتل؟“ سلی نے سوال کیا اور پھر خود ہی سوال کا جواب دیا۔ ”ضرور دیکھے ہوں گے اور تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کوئی بچہ اگر تتلیوں کے پیچھے بھاگتا ہوا ڈور نکل جائے تو وہ تتلی بے شک پکڑ لیتا ہے لیکن اپنے ساتھیوں کو کھو بیٹھتا ہے۔ تم بھی اسی بچے کی مانند ہو جو طاقت کی تتلی کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو کھو بیٹھتی ہو، تم وہ لونچ ہو جو اپنی ڈار سے پھڑک کر آسمان کی وسعتوں میں غم ہو گئی ہو۔ تم ایک چکوری بن گئی ہو، وہ بگلی جو ہر چاندنی رات میں چاند پر کندھا ڈالنے نکلتی ہے لیکن صبح دم تھک کر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ طاقت اور قوت بھی چاند کی مانند ہے جو اپنی چاندنی چار سو بکھیرتی تو ہے لیکن کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔“

”کیا فلسفہ لے بیٹھی ہو۔“ شیتل وہیں رک گئی۔ ”جب تمہیں طاقت حاصل ہو جائے تو تم تنہا نہیں رہتیں۔ طاقت تمہارے بستر میں تمہارے ساتھ سوتی ہے، تمہارے ساتھ جاگتی ہے، تمہیں اپنے حصار میں رکھتی ہے اور تمہیں سہلاتی رہتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے عظیم ترین شے ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے رُک کر اور پھر بولی، اس بار اُس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ”اور اگر تمہارے پاس طاقت ہوگی تو کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ طاقت تمہارا تحفظ کرتی ہے۔“

”تم اپنی طاقت کے ساتھ تنہا زندہ رہو۔“ سلی چڑ گئی۔ ”تمہاری باتیں تمہیں مبارک، میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ کوئی شخص بھی اپنے مخصوص محور سے ہٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا، میں کل صبح بمبئی واپس جا رہی ہوں، میرا گھر اور میرے درد و یار میرے منتظر ہیں۔“

سہلی چلی گئی۔ اُس نے رات کو ہی اُسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ صبح شاید وہ اُس سے نہ مل سکتی۔

وال کلاک نے رات کے دو بجائے تو شیتل چونک اٹھی۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم میز پر رکھا اور خط اٹھا لیا جو اُس نے ابھی ابھی اریبہ کو تحریر کیا تھا۔

”مائی ڈارلنگ!“

ریکس سے شادی کر کے امریکہ چلی جاؤ، ہر معاملے میں تمہیں میری طرف سے پیشگی اجازت ہے اور میں تم دونوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتی ہوں لیکن ایک درخواست بھی ہے کہ ریکس سے شادی کرنے سے پہلے اُسے مشرف بہ اسلام ضرور کر لینا کیونکہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے کہ کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم کی بیوی بنے اور دوسری جانب میں یہ نہیں سُننا چاہتی کہ ملکہ بحریت کی بیٹی اریبہ زاہدی نے کسی غیر مسلم سے شادی رچالی ہے۔

ممکن ہے جلد ہی تمہیں میرے بارے میں ایسی خبریں ملیں جنہیں تم نا پسندیدہ گردانو لیکن وقت سے مفاہمت کی کوشش کرنا۔ یہ جان کر کہ میں نے یہ سب اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کیا ہے۔

خوش رہو اور فرصت ملے تو کبھی آ کر مجھے بتانا کہ یہ سب کیسا لگتا ہے۔

محبتوں کے ساتھ ہمیشہ تمہاری

”جی: شیتل۔“

اُس نے لفافہ بند کیا اور ایک سمت ڈال دیا۔

”اے اللہ، مجھ پر رحم کر۔“ وہ بڑبڑائی اُس نے دونوں بازو میز پر لٹا لیے اور اُن پر اپنا

سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

چند لمحے یونہی گور گئے پھر اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے بزدل بادیا۔ رات کے اس پہر بھی باوردی ملازم چوکس تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور وہ اندر آ گیا۔

”جنرل ٹوری کو فوری طور پر بیدار کر کے میرے پاس بھیجا جائے۔“ اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”انہیں کہیے گا کہ مسٹر گوتم نیلا مبرمج سات بجے یہاں پہنچ رہے ہیں جب کہ میں ایک گھنٹے بعد جنرل ٹوری کا انتظار کروں گی۔“

باوردی ملازم نے یوں شیتل کو دیکھا جیسے وہ یاگل ہو گئی ہو لیکن حکم کا وہ غلام کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔

شیتل کچھ دیر سامنے والی دیوار سے نگاہوں کے ذریعے گفتگو کرتی رہی پھر اُس نے دراز سے شاہی مہر لگا ہوا نفیس کاغذ نکالا اور دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

شیتلا کملادتی موہن

پیدائش: 25 اگست 1942ء، سری نگر

وفات: 1980ء ریال، بحریت

ہر رائل میجسٹی شیتل ملکہ، بحریت

پیدائش: 1980ء ریال، بحریت

وفات: ؟

☆A☆S☆I☆F☆